آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے ❖ لو تمھیں طور تسلّی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر

جلد ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۱۸ء نمبر ۳

مطابق جمادی الثانی سنہ ۱۳۳۶ھ

چندہ سالانہ

عام طلباء سے ۲ر

فہرست مضامین

اعلیحضرت خلیفۃ المسیح حکیم الامت مولنا مولوی نورالدین صاحب کی مجرب المجرب ادویہ

ہم نے ناظرین کی خاطر اپنے اُستادی المکرّم کے تمام عمر کے مجرّبات بطور ہدیہ کے رکھدیئے ہیں۔ آپ نے بے شک مجرب ادویہ دیکھی ہونگی۔ مگر لاثانی وجود کی ایجاد بھی لاثانی ہوتی ہے۔ جیسے فن طب میں بے مثل تھے ویسے ہی آپکے تیر بہدف ادویہ بے مثل ہیں +

حبّ اکسیر جنین یہ گولیاں آپکی تمام عمر کی مجرّب المجرب ہیں ان کے استعمال سے خاص فضل ربی سے کئی گھر بھرے ہوئے ہیں۔ جو کہ اسقاط حمل یعنی اٹھرا کی بیماری کی وجہ سے ویران تھے۔ جنکی اولاد پیدا ہوتے ہی داغ مفارقت دیکر دل کو پاش پاش کردیتی تھی۔ یا قبل از وقت حمل ضائع ہوجاتے تھے یا کچھ دن پیدا ہونیکے بعد زندہ رہکر فوت ہوجایا کرتے تھے اور والدین کے کلیجے صدمے سہتے سہتے ناامید و مایوس ہوچکے تھے اب وہ گھران گولیوں کے استعمال سے بفضلہ تعالیٰ بھرے ہوئے ہیں۔ قیمت فی تولہ ۴؍ عہ

حبّ بواسیر خونی کیسا ہی خون کیوں نہ جاتا ہو۔ انکے استعمال سے بند ہوجاتا ہے۔ اور دیر تک استعمال کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ کلی نجات ہوگی قیمت ۲۴ گولی عہ/

حبّ جاوید ضعف دل و دماغ۔ جگر۔ جسم میں سُستی کاہلی۔ چہرہ بے رونق۔ بدن نحیف۔ آنکھیں زرد۔ معدہ میں فتور آگیا۔ غذا ہضم نہیں ہوتی۔ بیٹھکر اُٹھنے سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا۔ سر چکرا گیا۔ ان اصحاب کے لیئے حبّ جاوید کا استعمال کرنا تندرستی کا بیمہ کرنا ہے۔ اور کھوئی ہوئی طاقت کو واپس لانا انکا فرض ہے۔ قیمت ۵۴ گولیاں۔ صرف عہ/

طحال پُرانی سے پُرانی طحال یعنی ہانچہ کیوں نہ ہو ۲۴ روز کے استعمال سے انشاء اللہ تعالیٰ آرام آجاتا ہے۔ ۲۴ عدد گولیاں عہ/

مرہم پھوڑی پھنسی۔ پُرانے سے پُرانے زخم گندی گندی بلکہ ناسور تک بھی اسکے استعمال سے بالکل اچھے ہوجاتے ہیں۔ قیمت ڈبیہ عہ/

تریاق معدی کمزوری معدہ۔ ضعف ہضم۔ پیٹ کا پھولنا۔ قراقر۔ قے۔ متلی بدہضمی۔ ترش ڈکار۔ معدہ کی خرابی سے بے ترتیبی باخانہ۔ اسہال۔ غذا کا ہضم نہ ہونا۔ ان امراض کے لیئے ہے۔ قیمت شیشی عہ/

سرمہ نور کمزوری نظر۔ دھند۔ جالا۔ قریب کے کگرے۔ پڑوال۔ پھولا۔ تو ندی بیدار رطوبت کا جاری رہنا۔ آنسوؤں کا آنا۔ ان امراض میں اسکا نہایت مجرب المجرب سرمہ ہے۔ قیمت ۶ ماشہ صرف عہ/

ملنے کا پتہ:۔ **نظام جان عبدالرحمٰن کاغانی۔ قادیان ضلع گورداسپور**

درخواست دُعا۔ عزیز محمد خداداد خان سلمہ ربہ۔ جو عرصہ ایک سال سے لاپتہ تھا اُسکا خط بحمد اللہ ۱۰ فروری ۱۹۱۸ء کو کنسٹنٹی نوپل (قسطنطنیہ) سے مراد آباد پہنچا عزیز اللہ کے فضل سے بخیریت ہے۔ اور جنگی قیدیوں میں مقید ہے۔ جمیع بزرگان و ناظرین رسالہ ہذا سے التجا ہے کہ اسکی واپسی اور بخیریت وطن کو پہنچنے کے لیے اللہ عزوجل دعائیں کی جائیں۔ والسلام فقط

دعا کا محتاج۔ محمد ایوب خان رسالدار ۵۵ کیمل کور

اصلی عرق کافور	وقت پر صلاح	اصلی عرق کافور

جو دست ہوتے ہیں وہ خطرہ سے بچنے کیلئے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہیں۔
ڈاکٹر ایس کے برمن کی یہ صلاح ہے کہ موسم گرما آگیا ہے اس موسم میں کھانے پینے
یا رہنے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف رہتا ہے۔ اس سے بچنے کیلئے پہلے ہی
ایک شیشی اصل عرق کافور منگوا کر گھر میں ڈال رکھیں جس سے اپنے یا پردیسیوں
کی وقت پر حفاظت ہو سکے یہ اصلی عرق کافور عرصہ چونتیس ۳۴ سال سے
تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہے یہ عرق گرمی کے دست پیٹ کے
درد متلی کیلئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے قیمت ایک شیشی چار آنہ ۴؍
محصول ڈاک ایک سے ۴ تک ۵؍ دوا ہر جگہ دوکانداروں اور دوا
فروشوں سے مل سکتی ہیں ورنہ کارخانہ سے طلب کیجئے۔

طاعون کی مجرب دوا	پلیگ سے کیوں ڈرتے ہو	طاعون کی مجرب دوا

سوائے اور سب بیماریوں کے اس ڈرنیکا سبب یہ ہے کہ آجتک لاکھوں انسان
اس موذی عارضہ کے پنجہ ظلم سے ہلاک ہو چکے ہیں گاؤں کے گاؤں اجاڑ ہو گئے
شہر کے شہر تباہ ہو گئے اسوجہ سے اسکے نام ہی سے دہشت معلوم ہوتی ہے پلیگ میں مبتلا
ہونیکے بعد پھر کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن بنظر حفظ ما تقدم ڈاکٹر ایس
کے برمن کی پلیگ روکنے والی گولیاں منگوا کر ضرور رکھیں ان گولیوں کے
استعمال سے جسم کے خون میں کچھ ایسا اثر ہوتا ہے وقت پر ان گولیوں
کے استعمال سے ہزاروں انسان پلیگ سے محفوظ رہتے ہیں آپ بھی
غافل نہیں رہیں ایک گولی روزانہ ٹھنڈے پانی کے ساتھ نگل
جانا چاہیئے بچوں کو نصف یا چوتھائی قیمت ۳۶ گولیوں کی
ڈبیہ ۸؍ ۶۰ گولیونکی ڈبیہ ۱۲؍ محصول ڈاک ایک سے ۶ ڈبیہ تک پانچ آنہ ۵؍

جناب دیوان مہاراجہ بنارس بابو ایشر پرشاد رام نگر سے لکھتے ہیں آپ کا عرق کافور واقعی آبحیات ہے۔

دیکھئے مہاراجہ بہ کھم نرائن سنگھ دیو ضلع گیا سے تحریر فرماتے ہیں۔ آپکی دوا ہیضہ کو بہت جلد دور کرتی ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۰۲۷

اے پیغمبر بخدمتِ قرآں کمر بہ بند — زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضہم لبعضٍ ظہیرا

چودھویں صدی کی — بہت بڑی یادگار

بے نظیر حمائل مترجم

نظیر اسکی نہیں جمتی نظر میں غور کر دیکھا — بھلا کیونکر نہ ہو یکتا کلام پاک رحماں ہے

بطرز

یسّرنا القرآن

مع

حوالجات قرآنی وحوالجات تصانیف حضرت مسیح موعودؑ

گذشتہ سال سے میرا ارادہ ایک حمائل شائع کرنے کا تھا۔ سو اب اللہ تعالیٰ نے اس حمائل کے متعلق وہ امتیازات اور خصوصیات سوجھائی ہیں جو آجتک کسی حمائل میں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے یہ حمائل ایک مبتدی طالبعلم سے لیکر ایک بڑے سے بڑے عالم اور لکچرار اور مضمون نویس کے لیئے یکساں مفید ہے۔ جس محنت اور دماغ سوزی سے اس مقدس کام کا مسودہ طیار ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس کی یارت پر ہی موقوف ہے۔ یا کسی قدر ذیل کے نمونہ سے عیاں ہے۔ بغرض اطلاع مختصراً اس کی تفصیل یہ ہے (۱) ہر آیت کے متعلق۔ مطابق اور مترادف آیات کے حوالجات ساتھ ساتھ درج ہیں جو کلام الٰہی سمجھنے اور حل کرنے میں رہبر کامل ہونگی۔ (۲) جن آیات کی تفسیر یا ترجمہ یا اشارہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصانیف مقدسہ میں ہے۔ وہ حوالے بھی ہر آیت کے ساتھ درج ہیں۔ (۳) انڈکس پانچ قسم کے ہونگے (۱) پارہ کا انڈکس (ب) سورتوں کا انڈکس بلحاظ نمبر شمار کے بھی اور (ج) بلحاظ حروف تہجی کے بھی (د) مختلف مضامین قرآنی کا انڈکس۔ (ھ) تصانیف حضرت مسیح موعودؑ کی فہرست (۴) طرز خط نمونہ سے ظاہر ہے۔ نہایت خوشخط لکھائی ہوگی۔ اور چھپائی اور کاغذ بھی عمدہ ہوگا۔ نہایت صحیح انشاء اللہ آیت قرآنی کی کسی ایک غلطی کے پہلے پیش کرنیوالے کو ایک حمائل انعام دیجائے گی (۵) ترجمہ شاہ رفیع الدین کا تحت اللفظ لکھوایا جائیگا۔ اس ترجمہ میں اردو زبان کے موجودہ محاورات کو ملحوظ رکھکر کسی قدر مناسب تبدیلی بھی کی گئی ہے (۶) آیات کے نمبر صحیح ہوں گے۔ (۷) قرآن کریم کے سمجھنے اور حل کرنے کے اصول اور معیار فرمودہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی شامل ہوں گے غرضیکہ مندرجہ بالا خوبیوں کے لحاظ سے یہ حمائل اس قابل ہے۔ کہ ہر ایک مسلمان (خواہ مرد ہو یا عورت) اسکو سفر و حضر میں حرز جان اور رہبر ایمان بنا کر رکھے۔ دوستوں کو چاہیئے۔ کہ ۱۵ر مئی ۱۹۱۸ء سے پہلے پہلے درخواستیں پتہ ذیل پر بھیج دیں۔ کیونکہ بوجہ گرانی ان درخواستوں کے اندازہ کے مطابق ہی تعداد چھپوائی جائے گی۔ ہر درخواست کے ساتھ فی حمائل ۸ بطور پیشگی آنے ضروری ہیں پیشگی بھیجنے والوں کو ۸ فی حمائل رعایت بھی دی جائے گی۔ اصل قیمت ۔؍ہ ہوگی۔ اور اعلیٰ قسم کی جس میں کاغذ ولایتی اور مجلد ہوگی اور نوٹ وغیرہ کرنے کے لئے کاغذ بھی ہر صفحے کے ساتھ لگائے جائیں گے اس کی قیمت ۔؍۱۲ اسکے لیئے ۸ پیشگی آنے ضروری ہیں۔

ضروری نوٹ۔ ۱۵ر مئی کے بعد یا بغیر پیشگی کے درخواستوں کی تعمیل کی ذمہ واری نہیں بشرط گنجائش تعمیل ہوگی۔ ورنہ معاف کریں۔

لن تنالوا ۴ — آل عمران ۳ — ۱۱۱ - ۱۱۲

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

ہو تم بہتر امت جو نکالی گئی ہو واسطے لوگوں کے حکم کرتے ہو بھلائی کا اور منع کرتے ہو برائی سے

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ

اور ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب البتہ ہوتا بہتر واسطے انکے بعضے ان میں سے

111 الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى

ایمان والے ہیں اور اکثر ان کے فاسق ہیں ہرگز نہ ضرر پہنچا دینگے تمکو مگر ایذا تھوڑی

112 وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

اور اگر لڑینگے تم سے پھیر دینگے تم سے پیٹھ پھر نہیں مدد دیئے جاوینگے

حوالجات قرآنی — سورۃ / آیت (۱۱۱) ۱۰۵/۳ و ۱۵۷/۳ و ۱۱۰/۲ (۱۱۲) ۱۸۷ و ۱۲۱/۳ و ۱۲-۱۴/۵۹ و ۸۶/۲

ء از کلام مسیح موعودؑ — نام کتاب / صفحہ (۱۱۱) براہین حاشیہ ۵۴۷ و آئینہ کمالات اسلام ۱۹۷ و (۱) تحفہ گولڑویہ ۲۳ و ۲۲ نوٹ (۱) و چشمہ مسیحی ۳۸ (پ) ۴۰

ء سے مراد طبع اول ث سے طبع ثانی۔ اصلی حمائل اس نمونہ سے چار گنا زیادہ لمبی ہوگی۔

خاکسار محمد فخر الدین احمدی ملتانی مہتمم احمدیہ بک ایجنسی قادیان دار الامان

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

قرآن مجید کا اسلوب بیان

نمبر (۲)

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

ترتیب الفاظ

اگر عربی زبان کی مذکورۂ بالا خصوصیّت کو ملحوظ رکھا جاوے اور اسکے ساتھ ادب عرب بھی خواہ وہ اسلامی زمانہ کا ہو یا زمانۂ جاہلیت کا زیر نظر ہو۔ اور پھر قرآن کریم کا تدبّر سے مطالعہ کیا جائے تو اس کے عجیب اسلوب بیان کا بڑا انکشاف ہوتا ہے۔ جیسا کہ مَیں تمہید میں بیان کرچکا ہوں۔ قرآن مجید کی ہر سورۃ کی آیات ہی میں ترتیب نہیں پائی جاتی بلکہ ہر آیت کے اہم تر الفاظ بھی ایک خاص ترتیب سے واقع ہوئے ہیں۔ اور اس بلیغ و حکیمانہ طرز بیان کے ذریعے قرآن کریم دو تین لفظوں میں ہی وہ کچھ ظاہر کرجاتا ہے جسکا بصورت دیگر صفحے کے صفحے سیاہ کرکے بھی ادا کرنا دشوار ہوتا۔ اور لفظوں کی یہ ترتیب ہمیں اُن اہم تر الفاظ کی تعیینِ معانی میں بھی مدد دیتی ہے۔ بہت سے خیالات جن کی قرآن شریف میں تلقین کی گئی ہے خود عربوں کے لیئے بھی نئے تھے۔ اس واسطے وہی پرانے الفاظ جو عربی میں پہلے سے موجود و مروّج تھے ایک بالکل نئے مفہوم میں استعمال کیئے گئے

جس کا پتہ صرف متنِ قرآن ہی سے لگ سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید جابجا اپنی آپ تفسیر کرتا ہے
اگر اُن لفظوں کے اسلوب بیان میں کوئی ترتیب خاص نہ ہوتی تو ہمیں انکے معانی
بالکل معلوم ہی نہ ہو سکتے اور ایسی گڑبڑ واقع ہوتی کہ قرآن مجید کے مطالب کو
سمجھنا اور دوسری زبان میں ادا کر سکنا غیر ممکن ہو جاتا ؂

(قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے)

قرآن مجید کے ایسے الفاظ پر غور و تدبّر کرنیکے لیئے اوّل ہم اسی آیت کو لیتے ہیں جو کلام الٰہی میں سب سے پہلے آتی ہے اور بہت مشہور و معروف آیت ہے اور جسکے معنی غالباً تمام ناظرین کرام سمجھتے ہونگے یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (یعنی اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے) عربی زبان میں کسی چیز کا اصلی نام ایسا لفظ ہوتا ہے جو اسکی صفات و خواص پر دلالت کرتا اور اسے تمام دیگر اشیاء سے ممیّز کر دیتا ہے جس سے وہ لفظ کان میں پڑتے ہی سامع کا ذہن اس شے کی طرف منتقل ہو جائے۔ چنانچہ لفظ اسم بمعنی نام مشتق ہے وسم سے جسکے معنی نشان کے ہیں پس لفظ اسم کے معنی ہوئے وہ لفظ جو اپنے موسوم کا خود پتہ دیتا ہو یعنی جس چیز کا وہ نام ہے اسکی طرف دوسری چیزوں سے الگ صاف طور پر نشان دہی کرتا ہو۔ اب غور کیجئے کہ لفظ اللہ کیا ہے؟

(عربی میں اسماء بلحاظ معنی بھی اپنے مدلول کی طرف اشارہ کرتے ہیں)

وہ خدا تعالیٰ کا علم یا اسم ذات ہے اور عربی زبان میں اس لفظ کا امتیازِ خصوصی یہ ہے کہ بجز ہستیٔ باری تعالیٰ یعنی ذاتِ واجب الوجود کے وہ اور کسی ذات کی نسبت کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ کوئی بُت یا اور معبود باطل ہرگز ہرگز اللہ نہیں کہلا سکتا مشرکین عرب نے بھی کبھی اپنے دیوتاؤں کے متعلق یہ لفظ نہیں بولا۔ اور چونکہ باری تعالیٰ ذاتِ واحد ہے اسواسطے اس لفظ کی جمع بھی کوئی نہیں آتی۔ پس گویا کہ لفظ اللہ میں خود ہی خدائے پاک کی وحدانیت کا خیال موجود مرکوز ہے ؂

(لفظ اللہ خود توحید باری کا ثبوت ہے)

اسیطرح الرحمٰن کو لو۔ جو اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے اور جسکے معنی عام "بڑا بخشنے والا" کیئے جاتے ہیں۔ لیکن عربی زبان کی بلاغت کے ماتحت اس لفظ کا اصلی مفہوم "بخشنے والا" سے کہیں زیادہ پُر مغز و معنی خیز ہے اور وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک بہت ہی قریبی علاقہ ظاہر کرتا ہے۔ اس کا اشتقاق اصل میں رَحِمٌ سے ہے جس کا

مطلب ہے "اُس نے مہربانی یا شفقت پدری ظاہر کی"۔ چونکہ رحیم کو رحم (رحم مادر) کے ساتھ نہایت قرب کا تعلق ہے پس بادنیٰ تغیرِ تلفظ رحم کے معنی اُن جذبات ہمدردی و شفقت کے ہوگئے جن کا محرک قریبی رشتۂ خون ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہ لفظ پدرانہ مہر و محبت کو ظاہر کرتا ہے تو رحمٰن کے معنی اُسی لفظ رحِم سے اُس شخص کے ہوئے جو مہر و محبت کرتا ہو۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ کا یہ اسلامی نام رحمٰن لفظ رحیم سے زیادہ مبالغہ کا صیغہ ہے کیونکہ اس میں رحیم کی نسبت ایک حرف کی زیادتی ہے اور اصل روٹ کے اوپر زیادتی حروف مقابلتاً مبالغہ کے معنی پیدا کر دیتی ہے لہٰذا اسکے معنی "نہایت ہی مہر و محبت کرنیوالا" بنے۔ اور چونکہ انتہائی مہر و محبت کرنیوالا صرف ایک ہی وجود ہے یعنی وجود باری تعالیٰ اسواسطے اسلام میں خدا کے سوائے اور کسی کی نسبت اس لفظ کا استعمال جائز نہیں رحیم کا اطلاق تو انسان پر بھی ہو سکتا ہے لیکن رحمٰن کا نہیں ہو سکتا +

خدائے تعالیٰ کا دوسرا صفاتی نام رحیم بھی اسی لفظ رحم سے مشتق ہے۔ ان دونو میں فرق یہ ہے کہ ہمارے ساتھ خدائے تعالیٰ کی شفقت اور مہربانی و محبت۔ صفت رحمانیت کے ماتحت تو بلا مبادلہ یعنی ہماری کسی سعی و استحقاق کے بغیر ہی ہوتی ہے اور صفت رحیمی کا ظہور ہماری ساعی پر ہوتا ہے۔ اس طرح خداوند کریم کی بخشائشیں دو قسموں پر منقسم کیجا سکتی ہیں۔ ایک وہ نعماء الٰہی جنسے ہم بدون اپنی کوشش اور استحقاق کے تمتع اٹھاتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ مثلاً روشنی۔ حرارت۔ پانی۔ ہوا۔ اور زمین وغیرہ بہت سی ضروریات زندگی خدائے تعالیٰ نے ہمکو بغیر ہماری طرف سے کسی محنت یا طلب کے عطا فرما رکھی ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیزیں میری کسی محنت اور کوشش کا ثمرہ ہیں۔ بلکہ یہ سب بلا مبادلہ و استحقاق خدا کی صفت رحمانیت کے ماتحت ہمکو ملی ہوئی ہیں۔ دوسری وہ نعمتیں اور عطیات جو ہماری محنت اور کوشش کا نتیجہ ہیں مثلاً ہماری فصلیں۔ باغ چمن ہمارے گھر اور پارچات وغیرہ وغیرہ جنکے حصول کے واسطے ہمیں کچھ نہ کچھ سعی و جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ہماری وہ سعی و محنت بھی خدائے تعالیٰ کی امداد و عنایت کے بغیر انکو پیدا نہیں کر سکتی۔ اور یہی خدا کی صفت رحیمی ہے جسکے طفیل ہماری کوششیں پھل لاتی ہیں ÷

اس تشریح سے صاف طور پر یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کی صفت رحمانیت صفت رحیمی سے مقدم ہے کیونکہ ہم کوئی کام نہیں کر سکتے جب تک کہ اللہ پاک کے عطا کردہ وسائل اور قویٰ ہم کو حاصل نہ ہوں اور وہ رحمانیت کے ماتحت حاصل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ اس ترتیب سے آئے ہیں کہ پہلے رحمٰن ہے بعد میں رحیم۔ اب اگر کوئی شخص اس آیت کا انگریزی میں ترجمہ کرنے بیٹھے۔ تو خواہ وہ ان دونوں لفظوں کے فرق معنی کو سمجھتا بھی ہو تاہم عربی کی طرح دو ہی الفاظ میں مفہوم کو ادا کر نہیں سکتا اور اُسے بجز اسکے چارہ نہ ہوگا کہ بہت سے تشریحی الفاظ اس غرض کے لیئے اپنی طرف سے ملائے۔ مثلاً یوں کہے ،۔ اس خدا کے نام سے جو اپنی نعمتیں ہم کو بغیر بدلے کے بھی عطا کرتا ہے اور ہمارے کاموں اور ہماری عبادتوں اور کوششوں کے اعلیٰ نتائج بھی مرتب کرتا ہے۔ یا اسی کے قریب قریب کوئی الفاظ۔ حالانکہ عربی میں یہ دونوں لفظ (رحمٰن و رحیم) خود ہی بلحاظ اپنے لغوی معنوں کے ان تمام خیالات و مطالب پر حاوی ہیں ؛

توضیح مزید کے واسطے اب ہم تین مثالیں انگریزی کے مشہور تراجم قرآن سے پیش کرتے ہیں۔ سیل صاحب نے اپنے ترجمۂ قرآن میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی ان الفاظ میں کیئے ہیں :۔

In the name of most merciful God

روڈویل صاحب اس طرح لکھتے ہیں :۔

In the name of God the Compassionate, the merciful

پامر صاحب یُوں ترجمہ فرماتے ہیں :۔

In the name of the merciful and Compassionate God

اب یہ دو نو لفظ یعنی مرسی فل اور کمپیشنیٹ جو ہر سہ صاحبان نے رحمٰن و رحیم کے بجائے تھوڑے تھوڑے فرق یا تغیر ترتیب سے استعمال کیئے ہیں نہ انکے مفہوم صحیح کو ادا کرتے ہیں نہ اُس ترتیب کو جس سے یہ آیت موصوفہ میں واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ انگریزی کے یہ الفاظ دراصل رحمٰن و رحیم کے پورے طور پر مرادف ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تراجم میں

رحمٰن ورحیم کی تمیز اور انکی ترتیبِ وقوع کا خیال ہی سرے سے مفقود ہو جاتا ہے +

اب چند اور مثالیں لیجئے :-

۱- اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

۲- اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۳- مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

ان تینوں آیات میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا صفاتی نام ربّ آیا ہے جسکے معنی ہیں پیدا اور پرورش کرنے والا - اور پھر بتدریج ترقی دیکر کمال تک پہنچانے والا - دوسرا الرّحمٰن ہے تیسرا الرّحیم - چوتھا مٰلک یعنی آقا و بادشاہ اور جزا وسزا کے دن کا مالک و مختار +

ربّ رحمٰن رحیم اور مالک یوم الدّین میں ترتیب طبعی

اس موقعہ پر بھی اللہ تعالیٰ کی یہ چار صفات ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کی گئی ہیں جیساکہ رحمٰن اور رحیم بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم میں رکھے گئے ہیں - صفات الٰہیہ کی سب سے پہلی تجلی صفت ربوبیت کے ماتحت ہوتی ہے ربّ کے معنی ہیں پیدا کرکے پھر قائم رکھنے والا ربّ کے بعد صفت رحمانیت کا بیان ہے جسکے ماتحت باری تعالیٰ اپنی بعض مخلوق کو بعض دوسری مخلوق کی خدمت میں لگا دیتا ہے جیساکہ اس نے ہماری خدمت میں سورج اور چاند وغیرہ کو لگا رکھا ہے پھر یہی سورج اور چاند بعض اوقات انبیاءؑ کی روحانی خدمت کا باعث ہو جاتے ہیں - تیسرے درجہ پر خداوند تعالیٰ اپنی صفت رحیمیت کے ماتحت ہماری کوششوں کو بارور کرتا اور ہم کو منزل مقصود تک پہنچنے کے قابل بناتا ہے - چوتھے درجہ پر صفت مٰلک یوم الدّین ہے - جب خدا تعالیٰ میں پہلی تین صفات جلوہ گر ہو چکتی ہیں تو پھر طبعاً اسکی باری بھی آتی ہے - بعض لوگ اس ترتیب صفات پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ بلاغت اور فصاحت تو ایک خیال کے آہستہ آہستہ پھیلانے میں ہے نہ کہ تنگ کرنے میں جیساکہ یہاں کیا گیا ہے لیکن یہ اعتراض بالکل بیہودہ ہے کیونکہ اصل بلاغت تو اسمیں ہے کہ کسی چیز کا صحیح نقشہ بترتیب طبعی دیا جاوے اور وہ اس جگہ موجود ہے بتلایا ہے کہ مخلوق پر پہلی تجلی صفت ربوبیت کی ہوتی ہے پھر خلق کے بعد مخلوق کے مانگے بغیر اسکی

محنت کے ذرائعہ ترقی مہیا کیے جاتے ہیں پھر جب ذرائع کا احسن استعمال ہوتا ہے تو حقیقت جلوہ نما ہوتی ہے اور سب کے آخر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ - پس جس ترتیب کے ساتھ صفات الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے اسی ترتیب سے قرآن شریف نے انکو بیان کیا ہے اور یہی اعلیٰ درجہ کی بلاغت اور فصاحت ہے ؛

اب ایک اور مثال لو - سورۂ اعراف - رکوع ۳ کے شروع میں ارشاد ہوتا ہے :-
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ط - اے آدم کے بیٹو - ہم نے اتارا تمہارے اوپر لباس - جس سے تم اپنا ستر[۲] ڈھانکتے ہو اور جو زینت[۳] بھی ہے - مگر پرہیزگاری[۳] کا لباس سب سے اچھا ہے -

یہاں لباس کی غائت مقصود اور فوائد بیان کرنے میں ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کی جانب توجہ دلائی گئی ہے - لباس کا مفاد و مدعا تین ہی باتیں ہوتی ہیں اوّل یہ کہ وہ پردہ پوش ہو اور گرمی سردی سے جسم کا محافظ - دوسرے زیب و زینت تیسرے برائیوں سے بچنے کا ذریعہ اور وہ پرہیزگاری کا لباس ہے ؛

اب میں دو اور آیتیں پیش کرتا ہوں - ان سے بھی ناظرین کو اس بات کا پتہ لگیگا کہ قرآن مجید کا فلسفۂ اخلاق کیسے اعلیٰ اور عدیم النظیر اصول پر مبنی ہے :-
(۱) جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۔ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط
یعنی بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے لیکن جو کوئی معاف کردے اور یہ معافی ایسی برمحل اور صحیح طریق پر ہو کہ اس سے اصلاح ہوتی ہو تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے ؛

اس آیت سے عفو کا محلِ صحیح معلوم ہوتا ہے گویا قرآن شریف غیر مشروط درگذر کی تعلیم نہیں دیتا اور یہ نہیں سکھلاتا کہ بدی کا کسی موقعہ پر بھی مقابلہ کیا ہی نہ جائے اور مجرموں بدکاروں کو اپنے جرم و بدی کی سزا بالکل نہ ملے - بلکہ اس نے سزا دینے یا معاف کرنے کا ایک ایسا اصول رکھا ہے جسکی خوبی کا ہر ایک معقول پسند انسان کو قائل ہونا پڑتا ہے - وہ اس امر کا فیصلہ ستم رسیدہ مظلوم شخص کی رائے پر

چھوڑتا ہے کہ آیا اس موقعہ پر ظالم سے درگذر مفید ہوگی یا انتقام۔ اصل مقصود و مدِنظر اصلاح رکھی گئی ہے وہ جس طرح حاصل ہو اُسی طریق کو اختیار کیا جائے۔ بعض حالات میں مجرم کیلئے معافی مفید پڑتی ہے اور وہ آئندہ کے واسطے نصیحت حاصل کرکے اپنی اصلاح کرلیتا ہے۔ مگر برخلاف اسکے بعض اوقات درگذر سے وہ ارتکاب جرائم پر اور بھی دلیر ہوجاتا اور پہلے سے بھی زیادہ بدیاں کرنے لگتا ہے۔ اسواسطے خدائے تعالیٰ کا حکیمانہ کلام ایسا حکم دینا تو درکنار اسکو روا بھی نہیں رکھتا کہ مجرموں کو بے سوچے سمجھے اندھادھند معافی ہی دیدیا کریں۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ ہم غور و فکر سے کام لیکر یہ دیکھ لیا کریں کہ جس سے کوئی بدی سرزد ہوئی ہے اسکے ساتھ کونسا سلوک حقیقی بھلائی کا موجب ہوگا۔ جیسے بعض آدمی اسقدر کینہ توز ہوتے ہیں کہ انکا جوش انتقام کسی طرح فرو نہیں ہُوا کرتا وہ جب تک اپنے دشمن سے بدلہ نہ لیں اس کی بدسلوکی کو کبھی نہیں بھولتے۔ چاہے مدتیں گذر جائیں۔ اسی طرح بعض اللہ کے بندے اتنے نرم دل سینہ صاف بھی ہوتے ہیں کہ ہر موقعہ پر درگذر ہی کرنا جانتے ہیں خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ حالانکہ نرمی و معافی ہو یا سخت گیری و انتقام کشی۔ جب حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو اسکا انجام ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ جس شخص کے ساتھ پہلے درجہ کی بداخلاقی کا برتاؤ کیا جائے اور وہ اسپر چشم پوشی سے کام لے یا اس کی عزت یا عصمت پر حملہ ہو اور وہ اسکو صبر سے برداشت کرے اسکی نسبت یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس نے درگذر کی لیکن اگر نتائج کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو اسکی یہ درگذر ایک ذلیل و قابل نفرت حرکت ہوگی کیونکہ اس سے شرافت عصمت اور خودداری کو گزند پہنچتا ہے۔ اور کوئی ہوشمند و باغیرت انسان اسے ایک قابل تعریف اخلاقی خوبی نہیں کہہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید عفو و درگذر کے لیئے بھی ایک حد مقرر کرتا اور اسپر برمحل یعنی مفید و موجب اصلاح ہونیکی قید لگاتا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ چاہے موقعہ ہو یا بے موقعہ ہر حال میں اُسے ضروری قرار دے یا اخلاقی خوبی بتلائے پس ایک قصوروار سے بہرحال درگذر کرنا اور اپنے حق انتقام سے دستکش ہونا خواہ

اس کی خطا کیسی سنگین کیوں نہ ہو ہرگز کوئی اخلاقی خوبی نہیں جس کے حصول
کی انسان تمنا کرے بلکہ ضرر یا صدمہ کو جلدی یا بدیر فراموش کردینا تو انسان
کا ایک فطری خاصہ ہے جو ہم بچوں تک میں پاتے ہیں جنہیں ہنوز عقل و فہم
بھی کچھ ایسی نہیں ہوتی۔ پس کسی شخص میں محض اس وصف کا پایا جانا کوئی
قابلِ تعریف بات نہیں تاوقتیکہ وہ اس کے صحیح محل استعمال سے ہم پر یہ ثابت
نہ کردے کہ بطور ایک اخلاقی خوبی کے وہ سوچ سمجھ کر اس سے کام لیتا ہے فطری
خواص اور محاسنِ اخلاق میں جو بیّن فرق و امتیاز ہے اسکو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے
جب ایک انسان واجبی غور و فکر کے بعد نتائج نیک یا بد کو مدِّ نظر رکھکر کوئی کام
برمحل کرتا یا اس سے باز رہتا ہے تو اس کا وہی فعل بجائے خاصۂ طبعی کے اخلاقی
خوبی بنجاتا ہے یہ بات تو بہت سے ادنیٰ درجہ کے حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے کہ
وہ بالکل بے آزار ہوتے ہیں کوئی انہیں ستائے یا انکے ساتھ بدی کرے تب
بھی بیچارے مقابلہ نہیں کرتے۔ یوں تو ایک گائے کو بھی معصوم کہہ سکتے ہیں
اور ایک برّہ کو حلیم۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان خواصِ طبعی کی وجہ سے کوئی بھی
انہیں اخلاقِ فاضلہ سے متصف نہیں سمجھتا کیونکہ ان میں عقل و فہم کا مادہ ہی نہیں
جو نیک و بد میں تمیز کرسکیں یا برائی بھلائی سوچ سمجھ کر ایسا کرتے ہوں ؎

پس کسی کام کا برمحل یا بے موقعہ ہونا ہی تو ہے جو اسکو حق بجانب اور
قابلِ تعریف ٹھیراتا ہے یا ناحق اور مستوجبِ ملامت ؎

اس آیت سے بدی کرنے والے کے ساتھ سلوک کرنے کے تین مدارج ظاہر ہوتے
ہیں سب سے پہلے جزا کا لفظ آیا ہے - جس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ
بدی یا بدسلوکی کی گئی ہو وہ اپنا بدلہ لینے کا مجاز ہے مگر انتقام کشی میں اس کو
حق واجبی سے تجاوز کرنا روا نہیں۔ دوسرا لفظ **عفو** ہے یعنی درگذر کرنا
اور معاف کردینا۔ یہ دونو کام مجرم کی اصلاح کے خیال سے ہونے چاہئیں
نہ کہ ذاتی عناد یا بدلہ لینے کی نیّت سے۔ تیسرا لفظ اصلاح ہے یعنی

درستی یا سنوار۔ اور یہی انسان کا بہترین مقصود و مدعا ہو سکتا ہے *

اب ملاحظہ کیجئے کہ قرآن مجید کے موجودہ انگریزی تراجم میں اس آیت کے کیا معنی کیئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے رڈویل کے ترجمہ کو لو۔ وہ لکھتا ہے :۔

Let the recompense of evil be only a like evil. But he who forgiveth and is reconciled shall be rewarded by God Himself, for He loveth not those who act unjustly.

"یعنی بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہونی چاہیئے مگر جو معاف کر دے اور ملاپ یا صلح صفائی کرے اسکا بدلہ خود خدا سے ملیگا۔ کیونکہ وہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا"

پامر صاحب اسی آیت کا ترجمہ انگریزی میں اس طرح کرتے ہیں :۔

For the recompense of evil is evil like unto it; but he who pardons and does well etc:

ترجمہ۔ بدی کا بدلہ اسی درجہ کی بدی ہے مگر جو معاف کرتا ہے اور بھلا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ"

اسی طرح سیل صاحب لکھتے ہیں :۔

And who when an injury is done them avenge themselves (and the retaliation of evil ought to be an evil proportionate thereto) but he who forgiveth and is reconciled unto his enemy shall receive his reward from God; for He loveth not the unjust.

ترجمہ۔ اور جو لوگ (ایسے ہیں کہ) جب انہیں کوئی ضرر پہنچایا جائے تو اپنا انتقام

لے لیتے ہیں (اور برائی کا عوض چاہیئے کہ اسی درجہ کی برائی ہو) مگر وہ جو معاف کر دیتا اور اپنے دشمن سے صلح صفائی کر لیتا ہے وہ خدا سے اپنا بدلہ پائیگا کیونکہ وہ نا انصافی کرنیوالے کو دوست نہیں رکھتا" ۔

محولہ بالا اقتباسات سے صاف طور پر عیاں ہے کہ تراجم سے اصلاح کا وہ خیال بالکل نہیں ظاہر ہوتا جو قرآن مجید کی اصل عربی عبارت کا مفہوم ہے۔ بلکہ ان میں اَصْلَحَ کے لغوی معنی بھی سراسر غلط کیئے گئے ہیں۔ اَصْلَحَ کے معنی صلح کرنا ہرگز نہیں ہوتے۔ جیسا کہ روڈویل اور سیل صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے نہ اسکے معنی بھلا کرنے کے ہیں جیسا کہ پام صاحب نے کیئے ہیں۔ صلح کرنے کے لیئے تو لفظ ہی اور ہے یعنی صَلَحَ جو اسی مصدر کے دوسرے باب سے ہے۔ جسکے معنی ہیں کہ اس نے اپنے دشمن سے صفائی اور ملاپ کر لیا۔ اسی طرح بھلائی کرنیکے واسطے صَلَحَ یا صَلِحَ آتا ہے اور قرآن مجید میں اس مقام پر ان ہر دو میں سے ایک بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ لفظ اَصْلَحَ فرمایا گیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اس نے حالات یا معاملات کی اصلاح و درستی کی جیسے کہ صاحب تاج العروس اس معنی کی مثال میں لکھتا ہے اَصْلَحَهُ اللّٰهُ یعنی خدا نے اسکی حالت سنوار دی اسکے معاملات کی اصلاح کر دی ۔

غرض اس طرح سے صرف ایک لفظ کے معنی صریحاً غلط کرنے کے سبب ان انگریزی مترجمانِ قرآن سے وہ خیال ہی بالکل نظر انداز ہو گیا ہے جو قرآن مجید کا اصلی منشاء ہے اور وہ آیت زیر بحث کے صحیح معنی کرنے میں بالکل ناکام رہے ہیں ۔

اب ایک اور آیت کو لیتے ہیں۔ سورۂ نحل رکوع ۱۳ کے شروع میں ارشاد ہوتا ہے:۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ
یہ آیت دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کے تین درجوں کی طرف توجہ دلاتی ہو۔ سب سے

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان صرف اپنے محسنوں کے ساتھ نیکی کرے۔ ایک عام اور معمولی آدمی بھی جسے دوسروں کی نیکی کو سمجھنے اور اسکی قدر جاننے کا مادہ ہو یہ وصف حاصل کرسکتا اور احسان کے عوض احسان کرسکتا ہے۔ اس سے ذرا ترقی کرکے نیکی کا دوسرا درجہ ہے جسمیں انسان دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے میں پہل کرتا ہے اور جن لوگوں کا اسپر کوئی حق نہیں اُن کے ساتھ بھی مہربانی وحسن سلوک سے پیش آتا ہے۔ یہ نیکی کی درمیانی حالت ہے لیکن یہ نیکی بھی اکثر محدود ہوتی ہے اس لحاظ سے کہ اس کا کرنیوالا اپنی نیکی کے عوض شکرگذاری یا دعائے خیر کی توقع رکھتا ہے اور اگر کوئی ذرا سی بات بھی اپنے منشاء کے خلاف پائے تو ناسپاسی یا کفرانِ نعمت اس کا نام رکھتا ہے۔ وہ اپنی نیکی کے اعتراف کو خوشی خوشی قبول کرتا ہے۔ اور پھر بعض اوقات دوسروں پر کوئی بار اپنی احسان کے بدلے میں اس قسم کا ڈالتا ہے جسکو وہ بصورتِ دیگر (یعنی اس کا ممنون احسان نہ ہونیکی حالتمیں) کبھی خوشی سے برداشت نہ کرتے۔ اس نقص کو رفع کرنیکی غرض سے قرآن مجید نیکی کرنیوالوں کو اس طرح متنبہ فرماتا ہے کہ:-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی

(سورۃ البقر- آیت ۲۶۶) یعنی اے مومنو! اپنے صدقات کو احسان جتاکر یا ایذادیکر ضائع نہ کرو۔

لفظ صدقہ جسکے معنی عام طور پر خیرات کے کیئے جاتے ہیں اصل میں صدق سے نکلا ہے اور صدق اخلاص کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اگر اخلاصِ نیت نہ ہو تو خیرات محض ایک نمود اور بے سود ہوتی ہے۔ غرض دوسروں کے ساتھ نیکی یا احسان کرنے میں یہ ایک نقص یا کمزوری کی بات ہے کہ آدمی انپر احسان جتائے یا فخر کرے۔ اسواسطے خدائے تعالیٰ کی پاک اور کامل کتاب نے اس سے بھی بڑھکر نیکی کی تعلیم دی ہے جو اس کا تیسرا درجہ ہے اور جس میں کوئی نقص یا عیب نہیں یہ درجہ حاصل کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ انسان اپنی نیکی کا مطلق خیال نہ کرے

نہ سپاس گذاری کی توقع رکھے بلکہ خلق اللہ کے ساتھ بھلائی کرنیکا جذبہ اس
میں خالص ہمدردی کی راہ سے ہو۔ جیسے نہایت قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں
میں ایکدوسرے کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یا مثلاً ایک ماں میں اپنے بچوں کیلئے
ہوتا ہے۔ یہ خلقِ خدا کے حال پر مہربانی و احسان کرنیکا سب سے آخری اور اعلیٰ
ترین درجہ ہے جس سے بڑھکر کوئی اور درجہ ہو نہیں سکتا۔ اسے ایتائِ ذی القربیٰ
کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی عزیز اقرباء کی طرح مہربانی و عنایت کرنا۔
لیکن احسان کی ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ حالت تک کیلئے بہرحال ایک ضروری شرط
یہ لگا دی گئی ہے کہ اس کا ظہور بے محل نہ ہو بلکہ مناسب موقعہ پر عمل میں آئے۔
کیونکہ اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر ان اوصافِ حسنہ کا ظہور یا استعمال
احتیاط کے ساتھ نہ ہو تو بے اعتدالی و بداستعمالی سے یہی بدیاں بن سکتی ہیں۔
فحشاء کہتے ہیں ناواجب زیادتی یا افراط کو جو بجائے مفید ہونیکے اُلٹا نقصان
کرتی ہے۔ اور منکر اُس چیز کو کہتے ہیں جسے ضمیر بوجہ اسکے بے محل استعمال کے
ردّ کرتا ہے اور عقل اس سے کنارہ کرتی ہے۔ بغی کے یہ معنی ہیں کہ جب انسانی
جذباتِ ہمدردی جیسے مثلاً عزیز و اقرباء کے ساتھ ہوتے ہیں۔ غلط طور پر ظہور میں
آئیں جنکا انجام بجائے نیک کے بد ہو تو وہی طغیان و سرکشی کی شکل اختیار کر لیتے
ہیں۔ کیونکہ اصل میں بغی اُس بارش کو کہتے ہیں جو زیادتی یا حدِ اعتدال سے متجاوز
ہونیکے سبب فصلوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی لئے ہر بات کی جو بصورت اعتدال
نہایت مفید ہوتی افراط یا تفریط بغی کہلاتی ہے۔ اور نیز یاد رکھنا چاہیئے
کہ مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں محض کسی نیکی کا کرنا بھی کوئی اعلیٰ اخلاقی وصف
نہیں ہے جبتک کہ اس کا استعمال برمحل۔ مناسب موقعہ اور اصول عدل کے
ماتحت نہ ہو۔ وگرنہ یہ اوصاف صرف طبعی حالتیں اور پیدائشی یا جبلی صفات
ہیں جو عمدہ قوّت فیصلہ کے ذریعہ صحیح و برمحل استعمال کے سبب اخلاقی خوبیاں
بنجاتی ہیں۔ ان دونو آیتوں میں جو اعلیٰ اخلاقی تعلیم دی گئی ہے اسکا بائیبل

کے پہاڑی وعظ سے مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید تو ایک خاص منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے اسکے مدارج ترقی یا درمیانی مرحلے بھی بتا دیتا ہے۔ بحالیکہ بائیبل صرف معراج ترقی کو پیش کرتی ہے اور ان بیچ کی منزلوں کا پتہ نہیں دیتی جنہیں طے کرکے انسان اس معراج تک پہنچ سکے؛

اب ایک اور آیت کو لیجئے سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۲ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنٰهُ طٰئِرَهٗ فِي عُنُقِهٖ ۖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَأْ كِتٰبَكَ ۖ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

روڈویل صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:۔

And every man's fate have We fastened about his neck etc:

یعنی ہر ایک آدمی کی قسمت کو ہم نے اسکی گردن کے گرد باندھ دیا ہے۔

سیل صاحب انگریزی میں اسکے معنی یہ لکھتے ہیں:۔

The fate of every man have We bound about his neck etc:

اس کا مطلب بھی ترتیب الفاظ کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وہی کچھ نکلتا ہے جو روڈویل صاحب کے ترجمہ کا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح پامر صاحب اپنے ترجمہ میں یوں فرماتے ہیں:۔

And every man's augury have We fastened on his neck etc:

ان کے ترجمہ اور مذکورہ بالا ہر دو ترجموں میں زیادہ تر ایک لفظ کا فرق ہے جو عربی

لفظ طائر کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

طائر کا ترجمہ روڈویل صاحب اور سیل صاحب نے تو Fate یعنی قسمت کیا ہے اور پامر صاحب نے augury جسکے معنی ہیں وہ پرندہ جس سے شگون لیتے ہیں۔ اس عربی لفظ کے اصل معنی آیت زیر بحث میں انسان کے اعمال وافعال یا ان کے اثرات ہیں۔ ان انگریزی مترجموں کو یہ پتہ نہیں لگ سکا کہ اس آیت میں طائر کا ترجمہ فیٹ یا قسمت نہیں ہو سکتا کیونکہ طائر کا مفہوم وسیع ہے اور وہ یہاں قسمت کے معنوں میں چسپاں نہیں ہوتا۔ اور قرآن مجید نے اس غلطی و غلط فہمی سے جو اس موقعہ پر ہو سکتی تھی بچانے کے لیئے پہلے ہی لفظ کتاب اس سے آگے بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا اقرأ کتٰبک یعنی پڑھ اپنا لکھا ہوا۔ اگر یہ انسان کی قسمت ہوتی تو اسکی "کتاب" یا اسکا "لکھا" کیونکر کہا جا سکتا تھا؟ اور اسے پڑھنے کا حکم دینے سے کیا فائدہ تھا؟ تا وقتیکہ اسمیں انسان کو اسکی بداعمالیوں کا یقین دلانیوالے ثبوت نہ ہوں۔ اگر قسمت یا تقدیر ہوتی تو وہ تو خدا کی کتاب یا تحریر ہوتی نہ کہ انسان کی۔ پھر اگر اس تحریر میں کچھ برائیاں درج ہوتیں اور انسان انکا ذمہ وار و جوابدہ نہ ہوتا تو وہ حساب کتاب انسانی روح کے خلاف کوئی حجت ملزمہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تیسری آیت میں مجاز یا استعارہ کو چھوڑ کر اصل مفہوم کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرما دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۲ آیت ۱۶)

یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ قرآن مجید میں بعض آیات بعض دیگر آیات کو منسوخ کرتی ہیں۔ چہ جائیکہ ایسے صاف و صریح طور پر ایک ہی آیت کا ایک حصہ دوسرے کو رد کرتا ہو۔ جبکہ طائر کے معنی اعمال کے بھی ہو سکتے تھے تو یہ ان انگریزی مترجمانِ قرآن کی بڑی فاش غلطی ہے کہ انہوں نے اس لفظ کا ترجمہ قسمت یا تقدیر کیا لیکن

ناظرین کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ طائر کے اصلی اور ابتدائی معنی بھی پرند اور انسانی اعمال ہی ہیں (بلکہ بعض لُغت والوں نے طائر بمعنی عمل کی مثال میں قرآن مجید کی آیت زیر بحث کو ہی پیش کیا ہے) اور سب سے اخیر معنی جو اس لفظ کے عربی کتب لُغت میں دیئے گئے ہیں وہ شگون یا فال کے ہیں کیونکہ عرب لوگ پرندوں کی اُڑان سے فال لیا کرتے تھے ؎

ناظرین کے اطمینانِ مزید کے لیئے اور نیز اس غرض سے کہ انہیں اِن انگریزی مترجموں کی فاش غلطی اور عدم احتیاط کا اچھی طرح پتہ لگ جائے۔ مَیں ذیل میں چند حوالے دیتا ہوں جنمیں لفظ طائر کے معنی کیئے گئے ہیں:-

۱۔ شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلویؒ اس آیت میں طآئر کے معنی اعمالنامہ کرتے ہیں۔

۲۔ مولوی فتح محمد صاحب کہتے ہیں عمل کتاب بناکر۔

۳۔ ایفؔ سٹینگسؔ کی عربی انگریزی لُغت میں لفظ طآئر معنی پرندہ۔ فرشتہ عملؔ۔ فعلؔ۔ کامؔ۔ شگونؔ یا فالؔ۔ غصہؔ۔ جذبہ۔ روزی روٹی کیئے گئے ہیں۔ (صفحہ ۶۲)

۴۔ لینؔ کی لُغت عربی انگریزی میں لفظ طائر کی تشریح یہ لکھی ہے ۱۔ وہ لوگوں کے اعمال ہوتے ہیں جو خدا کے ہاں درج ہوتے رہتے ہیں (جلدہ صفحہ ۵-۱۹)

حضرت مرزا غلام احمد (مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام) حالات مابعد الموت کی کیفیت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

قرآن مجید نے بار بار بیان کیا ہے کہ حیات یا بعد الموت کوئی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اسی زندگی کے آثار و اظلال ہوتے ہیں۔ جیسے اعمال کسی نے موجودہ زندگی میں کئے ہونگے وہی اگلے جہان میں ظاہر ہوکر اسکے آگے جائیں گے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:- والزمنٰہ طآئرہٗ فی عنقہ الخ

یعنی ہمنے اسی زندگی میں انسان کے آثارِ اعمال اسکی گردن سے باندھ دیئے ہیں اور قیامت کے دن ہم انکو ایک کھلی ہوئی کتاب کی شکل میں ظاہر کر دینگے۔ اس آیت میں لفظ طائر خاص طور پر قابل غور ہے۔ اسکے لغوی معنی پرندکے ہیں اور یہاں اس سے بطور استعارہ لوگوں کے اعمال مراد ہیں۔ کیونکہ ہر ایک عمل نیک ہو یا بد ایک پرند کی طرح اُڑ جاتا ہے اور اس کا بھلا یا بُرا اثر بھی بظاہر مٹ جاتا ہے لیکن نیکی یا بدی کا ایک نقش قلب پر رہ جاتا ہے۔ پس قرآنِ پاک نے یہاں اس اہم اصول پر روشنی ڈالی ہے کہ انسان کا ہر ایک فعل اسکے قلب پر اپنا ایک مخفی اثر چھوڑ جاتا ہے۔ بلکہ در اصل ہر انسانی فعل کے نتیجہ میں ایک فعل خدائے تعالیٰ کی طرف سے ظہور میں آتا ہے۔ جو اسکے نیک یا بد اثرات کو نہ صرف اسکے قلب پر بلکہ ہاتھ پاؤں آنکھ کان وغیرہ اعضاء ظاہری پر بھی منقش کر دیتا ہے۔ اور وہ کتاب جس میں انسان کے تمام اعمال لکھے جاتے ہیں اور جو اسکی آنکھ سے پوشیدہ رہتی ہے اسی زندگی میں تیار ہوتی رہتی ہے۔ اگلے جہان میں کھلے طور پر ظاہر ہو کر اسکے سامنے آجائیگی۔" (مفہوم)

اِن تمام مثالوں سے بخوبی ظاہر ہو گیا ہوگا کہ لفظ طائر کے اصل معنی کیا ہیں جنکو سیل وغیرہ انگریزی مترجمانِ قرآن مجید نے نہیں سمجھا اور ایک بے پروائی سے اسکے غلط معنی کر دیئے ہیں جسکے سبب آیت زیر بحث کا مطلب انکے تراجم میں بالکل خبط ہو گیا ہے۔

اَب میں ایک اور آیت کو لیتا ہوں جس میں علامات و رموز اوقاف کی طرف سے بے پروائی کرنیکے سبب اسکے معنی اصل مفہوم کے بالکل برخلاف سمجھ لیئے گئے ہیں۔ یہ آیت پارہ ۱۷۔ سورۃ الانبیاءؑ کے رکوع ۵ کی ۶۴ آیت ہے۔ اور قرآن مجید میں اس طرح لکھی ہوئی ہے:۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ

یعنی اُس نے کہا۔ ہاں یقیناً کسی شخص نے تو یہ کام کیا ہی ہے۔ انمیں کا سب سے

بڑا تو یہ رہا۔ پس انہی سے پوچھو اگر وہ بول سکیں ؎

اس آیت میں فعلہٗ کے بعد جو چھوٹا سا حرف قاف لکھا ہوا ہے۔ وہ لفظ قِف کا مخفف ہے جسکے معنی ہیں (یہاں) ذرا ٹھیرو ؎

اس مقام پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اسکے چھپانے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ مگر اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے بلا توقف بے دھڑک اس کا اقرار بھی نہیں کیا اور انہوں نے جو کچھ کیا اس کی وجہ صرف بُت پرستوں کو یہ جتلانا تھی کہ تمھارے یہ جھوٹے معبود ایسے عاجز ہیں کہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ جس شخص نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور اب اسکے خلاف گواہی تک نہیں دے سکتے۔ اس کے سوائے اور کوئی وجہ ہو نہیں سکتی وگرنہ صاف ظاہر ہے کہ انہیں اپنے فعل کا اخفا کرنیکی خواہش اور کسی غرض سے نہیں۔ لیکن اگر ہم اس آیت میں علامتِ وقفہ (حرف ق) کی پروا نہ کریں تو پھر اس کے معنی اصل عربی عبارت کے بالکل برعکس ہو جائینگے ؎

سیل صاحب اس آیت کے معنی لکھتے ہیں :۔

"He answered, Nay, that biggest of them hath done it; but ask them if they can speak."

یعنی اُس نے جواب دیا نہیں بلکہ ان میں کے سب سے بڑے نے یہ کام کیا ہے لیکن ان سے پوچھو اگر وہ بول سکیں ؎

پامر صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں :۔

"Said he, Nay, it was this largest of them; but ask them if they can speak."

یعنی وہ بولا نہیں بلکہ ان میں سب سے بڑا ہے جس نے یہ کام کیا الخ

اسی طرح روڈ ویل صاحب فرماتے ہیں :-

He said, Nay, that their chief hath done it; etc:

اس کا اُردو ترجمہ بھی قریباً وہی ہوتا ہے جو دوسرے دو اقتباسوں کا اوپر لکھا گیا۔
شروع میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بُت پرستی کے خلاف بڑے زور سے وعظ و نصیحت کرتے ہیں۔ اور اس سے ضرور انکی شہرت عام ہو گئی ہو گی کہ یہ شخص بتوں کا دشمن ہے۔ جس کے سبب بتوں کو کسی قسم کا ضرر پہنچنے کی صورت میں قدرتاً لوگوں کا خیال اسی طرف منتقل ہو سکتا تھا کہ ابراہیمؑ نے انہیں توڑا پھوڑا ہے۔ لیکن آپ اسپر بھی اکتفاء نہ کر کے فرماتے ہیں :-

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ

ترجمہ۔ "خدا کی قسم مَیں ضرور تمہارے بتوں کی گت بناؤں گا یا خبر لونگا جب تم ان سے پیٹھ پھیر کر جاؤ گے۔"

پھر جب وہ چلے جاتے ہیں تو آپؑ انکے بتوں کو سچ مچ توڑ بھی ڈالتے ہیں۔
اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے سب سے بڑے بُت کو کیوں نہیں توڑا۔ کیا ان کی یہ مراد تھی کہ باقیوں کو پاش پاش کرنے کا الزام اُس کے سر پر تھوپیں۔ یا انہوں نے کسی اور غرض سے ایسا کیا؟ اس شبہ کو قرآن مجید خود ہی دُور کر دیتا ہے یہ بتلا کر کہ حضرت ابراہیمؑ نے بڑے بُت کو صحیح سلامت کھڑا رہنے دیا تاکہ جب ان معبودانِ باطلہ کے پرستار واپس آئیں تو پوچھیں کہ کس نے یہ کام کیا ہے؟ چنانچہ فرماتا ہے :-

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ

یعنی "اُس نے ان سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے سوائے بڑے بُت کے تاکہ وہ اسکی طرف رجوع کریں۔" اگر وہ سارے کے سارے بتوں کو توڑ ڈالتے تو بتوں کے پوجاری عذر کر سکتے تھے کہ وہ صحیح سلامت ہوتے تو بتلا دیتے

مگر جب ہلاک ہی کردیئے گئے تو کیسے بول سکیں؟ ممکن ہے کہ یہ دلیل آج کل کسی کے دل کو لگتی ہوئی معلوم نہ ہو لیکن جن لوگوں کو قدیم زمانہ کے بُت پرستوں کے احمقانہ خیالات کا ذرا بھی علم ہو وہ اسکو تعجب کی نظر سے نہیں دیکھینگے۔ جب بُت پرست یہ جواب دیتے ہیں کہ:-

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۤءِ يَنْطِقُوْنَ

"تُو یہ تو جانتا ہے کہ یہ (بُت) بولا نہیں کرتے۔"

تو اب حضرت ابراہیمؑ اور بھی زور کے ساتھ یہ کہکر انکی باطل پرستی کا ردّ فرماتے ہیں:-

فَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ۔ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

کیا تم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو نہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکیں نہ ضرر۔ تُف ہے! تمپر اور تمہارے ان معبودوں پر۔ کیا تمھیں اتنی بھی عقل نہیں؟

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام کو اس معاملہ میں خلاف واقعہ بات کرنے یا بُت پرستوں کو دھوکا دینے کی مطلق خواہش وضرورت نہیں ہو سکتی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن مجید کی آیات میں رموزِ اوقات کو ملحوظ رکھنے اور نہ رکھنے سے اصل مفہوم ومعنی کا بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ (باقی آئندہ)

حضرت مسیح موعودؑ کی پیشگوئیوں پر اعتراضات کا جواب

مقدمہ

(از حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔ اے)

حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے مخالف مولوی جنھوں نے اپنے دل میں یہ ٹھان رکھی ہے کہ ہر ایک بات میں حضرت مرزا صاحب

کی مخالفت کیجاوے اور عوام کو دھوکے میں ڈالا جاوے۔ عام طور پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ حضرت مرزا صاحب کی بعض پیشگوئیاں پوری نہیں ہوئیں اس سے معلوم ہوا کہ وہ (نعوذ باللہ) خدا کی طرف سے نہ تھے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ انکی سب پیشگوئیاں کمال صفائی کے ساتھ پوری نہ ہوں۔ مگر وہ لوگ جو قرآن شریف وحدیث کی تعلیم سے واقف ہیں اور گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے حالات سے بھی بیخبر نہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ یہ اعتراض نہایت بودہ اور سطحی ہے اور جس طرح مسیحی مذہب کی بعض تعلیمات دیکھنے کو تو اچھی نظر آتی ہیں مگر میدان عمل میں لغو بلکہ سخت ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں اسی طرح اس اعتراض کا حال ہے کیونکہ بادی النظر میں تو گو واقعی یہی خیال ہوتا ہے کہ جو خبر خدا کی طرف سے ہو وہ ہر صورت میں کمال صفائی کے ساتھ پوری ہونی چاہیئے کیونکہ خدا عالم الغیب ہے اور کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں۔ مگر ذرا غور سے اس معاملہ پر نظر ڈالی جاوے اور قرآن شریف کی تعلیم اور گذشتہ انبیاءؑ کے حالات کو مدنظر رکھا جاوے تو اس اعتراض کی ساری جھوٹی چمک جاتی رہتی ہے اور یہ اپنی اصل کمزوری اور بودہ پن کے لباس میں نظر آنے لگ جاتا ہے۔ جیسا کہ اگر خدا نے چاہا تو ناظرین کو ابھی معلوم ہو جائیگا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ لوگوں نے قرآن شریف کی تعلیم کو بالکل بھلا دیا ہے۔ اس لیئے وہ اسکے پیشکردہ معیاروں کو چھوڑ کر من گھڑت معیاروں پر حضرت مرزا صاحبؑ کی صداقت کو پرکھنا چاہتے ہیں حالانکہ ہر ایک مسلمان کہلانیوالے کا فرض ہے کہ اپنی طرف۔ سے صداقت کے معیار بنا کر حضرت مرزا صاحبؑ کی صداقت کو پرکھنا نہ شروع کرے۔ بلکہ یہ دیکھے کہ قرآن شریف کون سے صداقت کے معیار پیش کرتا ہے اور پھر انکے مطابق آپکے دعاوی کو ناپے کیونکہ مجرد عقل کے ساتھ تو ہر وقت غلطی کا احتمال ہے۔ لیکن قرآن شریف وہ کتاب ہے کہ:۔

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سورۃ حم السجدہ)

یعنی قرآن شریف تو وہ کتاب ہے کہ باطل اس کے پاس تک نہیں پھٹک سکتا۔

چہ جائیکہ اسکے اندر داخل ہو۔ پس چاہیئے کہ ہم کُلی طور پر اپنے خیالات کو قرآن شریف کے سپرد کردیں ؂

اب جب ہم قرآن شریف پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں لکھا پاتے ہیں :۔

فلا یظھر علٰی غیبہ احداً الا من ارتضیٰ من رسول (سورۃ جن)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو کثرت کے ساتھ مطلع نہیں کیا کرتا مگر اسی کو جسے وہ رسول بنا کر چُن لیتا ہے"

اس آیت کریمہ سے پتہ لگتا ہے کہ مصفا غیب یعنی ایسا غیب جس کا علم خدا کے ساتھ خاص ہو جیسا کہ لفظ غیبہ سے ظاہر ہے (کیونکہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے غیب کا لفظ مطلق نہیں رکھا کہ جو ہر ایک غیب پر بولا جا سکتا ہے بلکہ غیبہ کا لفظ رکھکر اسے مقید کر دیا ہے یعنی ایسا غیب جس کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہو یعنی وہ قیاس وغیرہ سے معلوم نہ ہو سکے بلکہ اس کا معلوم کرنا حالات موجودہ کے ماتحت انسانی علم سے بالاتر ہو) کثرت کے ساتھ صرف رسولوں ہی کو دیا جاتا ہے۔ کثرت کا مفہوم الفاظ یظھر علٰی غیبہ سے ظاہر ہے کیونکہ عربی زبان میں جب اظہر کے ساتھ علٰی کا صلہ آوے تو اسکے معنی غالب کردینے کے ہوتے ہیں جیسا کہ فرمایا :۔

ھوالذی ارسل رسولہ بالھدٰی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (سورۃ توبہ)

یعنی اللہ ہی نے اپنا رسول بھیجا ہے ہدایت اور دین حق کے ساتھ تا وہ اسے باقی تمام دینوں پر غالب کر دکھائے" پس اظہار علی الغیب کے معنی ہوئے غالب کر دینا کیا بلحاظ کیفیت اور کیا بلحاظ کمیت یعنی کثرت کے ساتھ مصفا غیب پر اطلاع دینا۔ ممکن ہے اسجگہ کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ دوسری جگہ قرآن شریف اسی بات کو ایسی طرح پر بیان کرتا ہے کہ نہ تو مصفّا غیب کی شرط قائم رہتی ہے اور نہ ہی غلبہ اور کثرت کی چنانچہ فرماتا ہے :۔

ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولٰکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء (سورۃ آل عمران ع ۱۸)

لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جاوے تو صاف ظاہر ہے کہ اسمیں بھی وہ دونو قیدیں موجود ہیں اور وہ اس طرح پر کہ یہ آیت کریمہ مدنی ہے یعنی مدینہ منوّرہ میں نازل ہوئی تھی اور آیت لا یظہر علٰی غیبہ الخ مکّی ہے یعنی اس آیت سے پہلے کی نازل شدہ ہے پس مصفّا غیب کی شرط پورا کرنے یئے تو ہم یہ کہیں گے کہ چونکہ مکّی آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیب کے لفظ کو ضمیر واحد کے ساتھ مقید کیا ہے اس لیئے بعد والی یعنی مدنی آیت میں الغیب میں جو ال رکھا گیا ہے اسکو بالضرور عہدی ماننا پڑیگا پس اس صورت میں الغیب کے بھی وہی معنی ہوئے جو غیبہ کے تھے۔ دوسرا سوال غلبہ اور کثرت کا رہجاتا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ آیت یظہر علٰی غیبہ میں رسولوں کے لیئے غلبہ علی الغیب یعنی کثرت کے ساتھ امور غیبیہ پر اطلاع دیئے جانے کا ذکر ہے مگر آیت لیطلعکم علی الغیب میں صرف غیب پر اطلاع دینے کا بیان ہے۔ مگر یہ اعتراض بھی سرسری نظر کا نتیجہ ہے ورنہ اصل میں دیکھا جاوے تو اس آیت کا بھی بعینہ وہی مفہوم ہے جو اوپر کی آیت کا ہے کیونکہ عربی زبان میں طلع کے اصل معنی بلند اور اونچا ہونے کے ہیں اسی لیئے جب سورج افق سے اوپر سر نکالے تو کہتے ہیں طلعت الشمسُ یعنی سورج اونچا ہو کر ہمکو نظر آنے لگ گیا۔ اسی طرح کہتے ہیں طلع الجبلَ یعنی وہ پہاڑ کے اوپر چڑھ گیا اور تاج العروس میں لکھا ہے اطلع راسہ کے معنی ہیں کہ کسی چیز کے اوپر بلند ہو گیا اسی واسطے اطلع اس مکان یا جگہ کو کہتے ہیں جو اتنی اونچی ہو کہ ارد گرد کی چیزیں نظر آنے لگیں۔ غرض طلع کے وضعی معنی بلند ہونے کے ہیں۔ اب ہم آیت زیر غور کو لیتے ہیں تو اس میں یطلعکم کا لفظ رکھا گیا ہے جس کے معنی ہوئے تمکو اونچا کرتا ہے اور اس طرح کُل آیت کے یہ معنی ہوئے کہ ’’نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ اونچا کرے تم کو غیب کے اوپر۔ مگر اس کام کے لیئے اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں کو،، اور ظاہر ہے کہ غیب پر اونچا کر دینے اور غالب کر دینے کا مفہوم واحد ہے یعنی دونوں میں

کثرت کا مفہوم ہے خلا اشکال - مگر اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ملّی آیت میں جو اظہار علی الغیب یعنی غالب کردینے کے الفاظ واقع ہوئے ہیں ان سے غیب کے اوپر کُلّی طور پر قابو دیدینے کا مفہوم سمجھنا غلط ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ دوسری جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے :-

قل لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء (سورۃ اعراف)

یعنی تو لوگوں کو کہدے کہ دیکھو اگر میں غیب جانتا تو پھر مجھے تکلیف کوئی نہ پہنچتی بلکہ میرے لیئے آرام ہی آرام ہوتا مگر تم دیکھتے ہو کہ مجھے بھی تکلیف پہنچ ہی جاتی ہے" غرض اللہ تعالیٰ نے یہ پختہ اصول بیان فرمایا ہے کہ کثرت کے ساتھ مصفّا غیب پر اطلاع صرف رسولوں کو ہی دیجاتی ہے گو دوسروں کو بھی گاہے گاہے سچے خواب آجاویں یا کوئی الہام ہوجاوے مگر کثرت کا مفہوم صرف رسولوں میں ہی پایا جاتا ہے پس اصولاً جس مدّعی ماموریت کے متعلق یہ ثابت ہوجاوے کہ اسکی بہت پیشگویاں جو مصفّا غیب پر مشتمل تھیں پوری ہوگئیں تو قرآن شریف کے روسے اسکی صداقت بہر حال ثابت ہے خواہ اسکی بعض پیشگویاں کسی کو بظاہر قابل اعتراض نظر آویں مثلاً اگر ایک شخص نے بہت سی پیشگویاں کیں جو مصفّا غیب پر مشتمل تھیں یعنی ایسا غیب جس کا علم خدا کی ذات کے ساتھ خاص ہے تو اگر ان میں سے اتنی پیشگویاں جنپر کثیر کا لفظ عرفاً اطلاق پاسکے پوری ہوجائیں تو آیت زیر بحث کے رُو سے اسکی صداقت بہر حال ثابت ہے کیونکہ اسمیں کثرت ہی کو معیار رکھا گیا ہے اور وہ یہاں موجود ہے اور یہ بات عقلاً بھی درست ہے کیونکہ جب ایک شخص کسی ایسی بات کی پیش از وقت خبر دیتا ہے جس کا حالات موجودہ کے ماتحت پیش از وقت معلوم ہونا یقینی طور پر عقل انسانی سے بالا ہے اور جس کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہوسکتا تو لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ اسکو اللہ تعالیٰ ہی نے اسپر اطلاع دی ہے جو عالم الغیب ہے - پس میں کہتا ہوں کہ ایک ہی سچا پیشگوئی جو حقیقتاً

مصفّا غیب پر مشتمل ہو یہ ثابت کرنیکے لئے کافی ہے کہ وہ خبر خدا کی طرف سے ہے لیکن ہاں ایسی ایک خبر مخبر کی رسالت پر دلیل نہیں ٹھیر سکتی نہ عقلاً اور نہ شرعاً کیونکہ ایک سے یہ تو بیشک معلوم ہوگیا کہ وہ خبر خدا کی طرف سے ہے مگر مخبر کی رسالت کا ثبوت نہ ملا۔ کیونکہ بعض اوقات خدا کی طرف سے عام لوگوں کو بھی سچے خواب یا سچے الہام ہو جاتے ہیں تا انکے لئے ایسی چیز کا وجود ہی وہمی نہ ٹھیرے مگر ہاں ایسی اخبار کی کثرت بیشک اسی کے ساتھ خاص ہونی چاہیئے جو خدا کے ساتھ تعلق میں بھی خصوصیّت رکھتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں رسالت کے لئے صرف کثرت ہی کو معیار ٹھیرایا ہے۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ جہاں تم یہ دیکھو کہ ایک شخص کو کثرت کے ساتھ مصفّا غیب پر اطلاع ملتی ہے اور وہ پوری بھی نکلتی ہے تو جان لو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہے کیونکہ کثرت کے ساتھ امور غیبیہ پر اطلاع صرف رسولوں ہی کو دی جاتی ہے اور یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ایک شخص اللہ کا رسول نہ ہو اور پھر کثرت کے ساتھ اسکو مصفّا غیب پر اطلاع ملے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اگر کثیر التعداد پوری ہونیوالی پیشگوئیوں کے ساتھ بعض ایسی بھی ہوں جو اپنی ظاہری صورت میں ایسی نظر آویں کہ گویا نہیں پوری ہوئیں تو پھر کیا سمجھا جاوے۔ سو اسکے جواب میں پیشتر اسکے کہ قرآن شریف سے ہی کوئی آیت پیش کی جاوے۔ مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی صورت میں بھی یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ پیشگوئی کرنے والا جھوٹا ہے۔ کیونکہ جب اسکی کثیر التعداد پیشگویاں جو مصفّا غیب پر مشتمل تھیں پوری ہو گئیں تو وہ مطابق فیصلہ الٰہی فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ بہرحال فرستادہ الٰہی ہے جھوٹا نہیں ہو سکتا پس ایسی صورت میں لامحالہ یہی سمجھا جاویگا کہ ہماری کمزور نظر ہی دھوکا کھاتی ہے ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک شخص سچا بھی ہو اور جھوٹا بھی۔ یعنی ایک طرف تو اسکی کثیر التعداد

پیشگوئیاں پوری ہوکر اسکی صداقت ثابت کر رہی ہوں اور دوسری طرف وہ بعض پیشگوئیوں کے ظاہر کے مطابق پورا نہ ہونے کی وجہ سے جھوٹا بھی ثابت ہو۔ یہ ایک صاف بات ہے کہ اگر ایسی بعض پیشگوئیوں سے مدعی کا کذب ثابت ہوتا ہو تو نہ صرف نعوذ باللہ قرآن شریف ہی غلط ٹھیرتا ہے جو بلند آواز سے کہہ رہا ہے کہ جسے کثرت کے ساتھ امور غیبیہ پر اطلاع ملے وہ خدا کی طرف سے ہے بلکہ ساتھ ہی عقل کو بھی جواب دینا پڑتا ہے۔ مگر قربان جائیے اسلام پر کہ جس نے اس صاف نتیجہ کے نکالنے کا کام بھی ہم پر نہیں چھوڑا کیونکہ انسان ایسا ضعیف البنیان ہے کہ بعض اوقات باوجود روشنی میں ہونے کے ٹھوکر کھا جاتا ہے اسلیئے اللہ تعالیٰ نے خود اس سوال کو قرآن شریف میں اُٹھا کر اس جھگڑے کا ایسا کامل فیصلہ فرما دیا ہے کہ کسی چون وچرا کی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ صرف مشکل یہ ہے کہ :-

یارب ان قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورا (سورۃ فرقان)

فرماتا ہے :-

هو الذی انزل علیک الکتاب منه آیات محکمات هن ام الکتاب واخر متشابهات فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون آمنا به کل من عند ربنا (آل عمران رکوع ۱)

یعنی اللہ ہی نے کتاب اُتاری ہے۔ جس کی بعض آیات تو محکم (یعنی پکی اور واضح) ہیں سو وہی اصل کتاب ہیں۔ اور بعض آیات متشابہات میں سے ہیں (یعنی ایسی جنہیں شبہ واقع ہوتا ہے اور جن کے کئی معنی ہو سکتے ہیں) پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ تو انہیں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کے غلط معنی کریں۔ اور نہیں جانتا ان کے

صحیح معنی سوا اللہ کے اور ان لوگوں کے جو کہ علم میں پکّے ہیں۔ یہ علم میں پکّے لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں انپر سب آیات ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔" دیکھیئے اس آیت کریمہ میں کس صفائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمکو بتایا ہے کہ خدا کی طرف سے جو آیات آیا کرتی ہیں ان میں سے بعض متشابہات بھی ضرور ہوا کرتی ہیں تاکہ مومنوں اور کجرو لوگوں کے درمیان امتیاز ہو جاوے اسی لیئے نبی کریم ؐ نے فرمایا ہے کہ:- فاذا رأیتم الذین یتبعون ما تشابه منه فاولئك الذین سمی الله فاحذروهم (بخاری)

پھر فرمایا:- اذا رأیتم الذین یجادلون فیه فهم الذین عنی الله فاحذروهم (مسند احمد) یعنی جب تم ان لوگوں کو دیکھو کہ پیچھے پڑے رہتے ہیں متشابہات ہی کے۔ تو جان لو کہ انہیں کا اللہ نے نام لیا ہے پس ان سے بچو۔" پھر فرمایا "جب تم دیکھو ان لوگوں کو کہ جھگڑا کرتے ہیں متشابہات کے بارہ میں پس جان لو کہ وہی لوگ ہیں جو مراد لیئے اللہ نے پس ان سے بچو۔" گویا کہ اللہ نے ہم کو ایک گُر بتایا ہے جس کی مدد سے ہم بڑی آسانی کے ساتھ کجرو لوگوں کا پتہ لے سکتے ہیں اور ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کی نیّت خراب ہے، اور وہ گر یہ ہے کہ جو شخص آیات اللہ میں سے محکمات کو چھوڑ کر صرف متشابہات کے پیچھے پڑا رہے اور ان کے بارے میں مومنوں سے جھگڑا کرے تو جان لو کہ اس شخص کے دل میں کجی ہے اور ایسا کرنے میں اسکی نیّت صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر فتنہ پیدا کرے اور حق سے روکے پس اس سے بچو۔ ہمارے مخالف بھی حضرت مرزا صاحب ؑ کی صرف ان دو تین پیشگوئیوں کو لیکر لوگوں میں شور مچاتے رہتے ہیں کہ جنہیں سنت اللہ کے موافق تشابہ واقع ہوا ہے مگر حرام ہے اگر ان پیشگوئیوں کا نام تک لیں جو ایک بڑی کثیر تعداد میں ہیں اور کمال صفائی کے ساتھ پوری ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں ان لوگوں پر سرور کائنات کا یہ فرمان پورا صادق

آتا ہے کہ اذا رأیتم الذین یتبعون ما تشابه منه فاولئك الذین سمّی الله فاحذروھم (بخاری) یعنی جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو محکمات کو چھوڑ کر صرف متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تو جان لو کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا اللہ نے ذکر کیا ہے پس ان سے بچو (تا تم کو فتنہ میں نہ ڈالیں)

آیت زیر غور میں جو محکمات کے لئے ام الکتاب کا لفظ رکھا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ اپنی ماں کی طرف جھکتا ہے اور اس سے مدد چاہتا ہے اسی طرح محکمات متشابہات کے لئے بطور ماں کے ہیں یعنی متشابہات کے معنوں کی وضاحت کیلئے ان کو محکمات پر حمل کرنا چاہیئے۔ متشابہات ان آیات کو کہتے ہیں کہ جن کے معنوں میں وضاحت نہ ہو بلکہ صرف کامل غور اور خوض کے بعد ان کے صحیح معنوں کا پتہ چل سکے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی میں متشابہات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ لا یتضح مقصودھا لاجمال او مخالفة ظاهر الا بالفحص والنظر۔ یعنی متشابہات وہ ہیں کہ ان کا صحیح مفہوم واضح نہیں ہوتا بوجہ اجمال کے یا اس وجہ سے کہ ان کا اصل مفہوم ظاہری مفہوم کے خلاف ہوتا ہے مگر ہاں غور اور تدبّر کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔" پھر یتبعون ما تشابه منه کی تفسیر میں لکھا ہے فیتعلقون بظاهره او بتاویل باطل یعنی کجرو لوگ یا تو متشابہات کے ظاہری مفہوم پر جم جاتے ہیں اور ان کو ان کے ظاہر پر حمل کرتے ہیں یا پھر کوئی باطل تاویل کر ڈالتے ہیں تاکہ شبہات ڈال کر لوگوں کو حق سے روکیں۔

غرض یہ ایک یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آیات آتی ہیں ان میں سے سب محکم نہیں ہوا کرتیں بلکہ بعض متشابہات کا رنگ رکھتی ہیں تاکہ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کجرو لوگوں اور مومنوں کے درمیان تمیز پیدا ہو جاوے۔ علاوہ ازیں اگر سب آیات ہی محکم ہوں اور مخالف کسی طرح بھی ان میں کجی کا راستہ نہ نکال سکے تو ایمان بالغیب کا ثواب کس طرح

قائم رہے۔ ظاہر ہے کہ ایمانیات میں ایک حد تک ضرور اخفا کا پردہ بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر اخفا کا پردہ اٹھ جاوے تو ایمان کا ثواب کیسا۔ کیا سورج پر بھی ایمان لانے کا کوئی ثواب ہے؟ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو ملامت کرتا ہے کہ باوجودیکہ وہ آنحضرت صلعم کے متعلق اس حد تک عرفان رکھتے ہیں کہ جو ان کو اپنے بیٹوں کے متعلق ہوتا ہے، یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم (سورۃ بقر) پھر وہ ایمان نہیں لاتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب اس حد تک عرفان حاصل ہو جاوے تو فوراً مان لینا چاہیئے ورنہ انسان موردِ غضب الٰہی ٹھیرتا ہے۔ مگر خدارا غور تو کرو کہ اپنے بیٹوں کے متعلق انسان کو کس حد تک یقین ہوتا ہے کہ وہ اسی کے بیٹے ہیں نطفہ غیر نہیں ہیں۔ بتاؤ تو سہی کہ سوائے اسکے کہ آدمی کو اپنی بیوی پر حسن ظنی ہو کہ یہ بدکار نہیں ہے اور کون سی دلیل ہے جو یہ یقین کرا سکے کہ جو اسکی بیوی نے جنا ہے وہ اسی کی اولاد ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ زید تو اپنی بیوی کے متعلق یہ سمجھتا ہو کہ یہ پاکدامن ہے مگر وہ دراصل بدکار ہو اور جو بیٹا زید کا ظاہر کر رہی ہو وہ ہو دراصل بکر کا؟ اگر کہو کہ باپ اور بیٹے میں شکل کی مشابہت ہوتی ہے تو یہ ایک نہایت بودی بات ہے اور اس سے بھی سوائے زیادہ سے زیادہ ظن غالب کے اور کوئی درجہ علم کا حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ڈاکٹری تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ شکل کی مشابہت اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جس سے مشابہت ہو لڑکا اسی کا نطفہ ہو بلکہ جماع کے وقت اور دوران حمل میں جس قسم کے اثرات عورت پر غالب ہوتے ہیں اسی قسم کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ولایت کا واقعہ ہے کہ ایک پاکدامن بی بی کے ہاں بالکل حبشی لڑکا پیدا ہو گیا اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ چونکہ جماع کے وقت اسکے سامنے ایک مہیب حبشی کی تصویر لٹک رہی تھی اسلیئے اس اثر کے ماتحت بچہ نے حبشی کی شکل اختیار کر لی اور پھر میں کہتا ہوں کہ کیا یہ مشابہت سب جگہ موجود ہوتی ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ اسّی فیصدی تو باپ اور بیٹے میں کسی مشابہت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ پس یہ کس طرح یقینی ثبوت ہو سکتا ہے ❊

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ جس قسم کا یقین حضرت مرزا صاحب کے متعلق ہماری مخالف

چاہتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی بالعموم لوگوں کو اپنی اولاد کے صحیح النسل ہونے کے متعلق نہیں ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ بدظنی کے پہلو نکالے جاتے ہیں۔ خدا تو کہتا ہے کہ جب تمہارے لیئے ایک شخص کی صداقت پر اسقدر قرائن جمع ہوجاویں جسقدر اس بات پر ہوتے ہیں کہ جو تمہاری اولاد کہلاتی ہے وہ واقعی تمہارے ہی نطفہ سے ہے تو تم کو چاہیئے کہ تم اسے مان لو ورنہ موردِ غضب الٰہی ٹھیرو گے۔ جائے غور ہے کہ کیا انسان کو اپنی اولاد کے متعلق ایسا یقین ہوتا ہے کہ کوئی اخفا کا پردہ درمیان میں نہ رہے ظاہر ہے کہ نہیں ۔ا اور ہر گز نہیں ہوتا تو پھر رسولوں کے متعلق بھی ایمان کا ابتدائی مرتبہ یہی ہے اس سے بڑھکر نہیں و من ابتغی وراء ذالک فقد خالف القرآن و بغیٰ ؂

یہاں تک مینے ناظرین کو یہ بتایا ہے کہ آیات اللہ میں متشابہات کا وجود کوئی جائے اعتراض نہیں ہے بلکہ سنت اللہ اسی طرح پر ہے کہ اللہ کی طرف سے جو آیات آتی ہیں ان میں سے ضرور بعض متشابہات بھی ہوتی ہیں۔ اسکے بعد میں مینے بتایا ہے کہ متشابہات کے ہونے میں کونسی حکمت ہے۔ اب میں بفضلِ خدا یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آیات اللہ میں کس طرح تشابہ واقع ہوجاتا ہے یعنی اب تک تو مینے یہ بتایا ہے کہ کیوں تشابہ ہوتا ہے۔ اب یہ بتاتا ہوں کہ کس طرح تشابہ واقع ہوجاتا ہے لیکن چونکہ اس موقع پر آیات اللہ میں سے اس مضمون کے ساتھ صرف وہ آیات تعلق رکھتی ہیں جو ایک مدعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر پاکر پیشگوئیوں کے رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اسلیئے میں صرف اسی پہلو کو لونگا وما توفیقی الا باللہ ؂

تشابہ کی مختلف صورتیں بیان کرنے سے پہلے اس بات کا بیان کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ عام طور پر یہ ایک فطرتی تقاضا ہے کہ جب انسان کسی چیز کا ذکر سنتا ہے تو اس کے متعلق ضرور اپنے دل میں ایک نقشہ جما بیٹھتا ہے حالانکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے نقشے عام طور پر بعد میں مشاہدہ پر غلط ثابت

ہوتے ہیں مگر تاہم یہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ کے اندر نہ آئی ہو مگر اس نے اس کا ذکر سُنا ہے اس کے متعلق ضرور اسکی قوّت متخیلہ کوئی نقشہ تجویز کر لیتی ہے۔ یہی حال پیشگوئیوں میں ہے۔ جب انسان کسی پیشگوئی کو سنتا ہے تو اس کے آئندہ ظہور کا اپنے ذہن میں ایک نقشہ کھینچتا ہے۔ کہ وہ اس طرح پر پوری ہوگی۔ اس حد تک تو نیک و بد سب شریک ہوتے ہیں۔ لیکن جن کی طبیعت میں سلامت روی کا مادہ کم ہوتا ہے وہ اسی حد تک نہیں ٹھہرتے بلکہ آہستہ آہستہ اس نقشہ پر ایسے پختہ ہو جاتے ہیں کہ بعد میں اسکے خلاف کسی واضح دلیل کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے اور یہی کہتے چلے جاتے ہیں کہ اسے تو اس طرح پورا ہونا چاہیئے تھا حالانکہ جو احتیاط کی تعلیم ہمکو اسلام سکھاتا ہے اس کا تو یہ تقاضا ہونا چاہیئے کہ ہم کسی پیشگوئی کے آئندہ ظہور کی کیفیت کے متعلق کسی بات پر جم نہ جائیں بلکہ انتظار کریں کہ وہ پیشگوئی کس مفہوم میں پوری ہوتی ہے مگر ایسا نہیں کیا جاتا بلکہ ہر ایک پیشگوئی کے آئندہ ظہور کی کیفیت اپنے ذہنوں میں پختہ طور پر جما لی جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب پیشگوئی کا ظہور کسی اور مفہوم میں ہوتا ہے تو ایسے لوگ تردد میں پڑ جاتے ہیں اور پیشگوئی کی صداقت کے متعلق شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ پیشگوئی اپنے صحیح مفہوم میں پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ گویا اس طرح بھی بعض اوقات لوگ اپنے رستہ میں آپ مشکلات پیدا کر لیتے ہیں۔*

اب میں تشابہ کی وہ عام صورتیں بتاتا ہوں جنکی وجہ سے بعض آیات اللہ متشابہات کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ سو واضح ہو کہ جس طرح ہماری تحریر و تقریر میں بعض وقت مجاز اور استعارہ اور کنایہ کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھکر اللہ تعالیٰ کے کلام میں بھی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاز اور استعارہ اور کنایہ کے استعمال سے علاوہ اس کے کہ کلام زیادہ لطیف اور فصیح ہو جاتا ہے یہ بات بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ نازک خیالات مختصر الفاظ میں اور کئی لطیف پیرائیوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں جیسا کہ علم بیان میں اس کا

مفصل ذکر ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس طرز کو کثرت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ اور صرف قرآن شریف ہی میں نہیں بلکہ گذشتہ نوشتوں میں بھی مجاز اور استعارہ کا استعمال عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے مسیحی صاحبان نے غور نہیں فرمایا ورنہ وہ اگر ذرا غور کریں تو ان کو صاف معلوم ہو جاوے کہ جس ابن اللہ کے لفظ سے وہ مسیح کی خدائی نکالتے ہیں وہ لفظ تو بائیبل میں اس کثرت کے ساتھ خدا کے پیاروں بلکہ ساری مخلوقات کے لیئے استعمال کیا گیا ہے کہ اگر اس سے کسی چیز کی خدائی نکل سکتی ہو تو ساری دنیا ہی خدا بنجاوے۔ مگر افسوس جو لفظ بطور مجاز کے استعمال ہوتا ہے اسے اصل وضع پر محمول سمجھ لیا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں سے تو میں سمجھتا ہوں کسی مثال کے بھی لانے کی ضرورت نہیں کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس میں بیسیوں واضح مثالیں ایسی موجود ہیں جہاں الفاظ ان کے اصل وضعی مفہوم سے ہٹاکر بطور مجاز و استعارہ استعمال کیئے گئے ہیں اور یہ سب باتیں عام کتب تفاسیر میں درج ہیں۔ مثلاً یہی دیکھیئے خدا فرماتا ہے:۔

ومن کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ (سورۃ بنی اسرائیل)

یعنی "جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا"۔

اس جگہ جیسا کہ ظاہر ہے اندھے سے روحانی اندھا مراد ہے نہ کہ وہ جس کی جسمانی آنکھیں نہ ہوں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ پیشگوئیوں میں بھی بعض اوقات اسی طرز کو اختیار کرتا ہے یعنی کسی لفظ کو استعمال کرتا ہے مگر مراد اس سے وہ مفہوم نہیں ہوتا جسکے لیئے وہ لفظ موضوع ہے بلکہ کچھ اور مراد ہوتا ہے۔ مثلاً یہود کو حضرت عیسیٰؑ کی آمد کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی یہ بھی بتائی گئی تھی کہ مسیح کے ظہور سے پہلے حضرت الیاسؑ جو انسے پہلے ایک رسول ہو گذرے تھے دوبارہ دنیا میں نازل ہونگے اور ان کے نزول کے بعد حضرت مسیح کا ظہور ہوگا (ملاکی باب ۴ آیت ۵ و ۶) اسی واسطے جب حضرت عیسیٰؑ نے

دعویٰ کیا تو یہود نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہی عذر پیش کیا کہ مسیحؑ سے پہلے الیاسؑ کا دوبارہ آنا ضروری ہے (متی باب ۱۷ آیت ۱۰۔ مرقس باب ۹ آیت ۱۱) اسکے جواب میں مسیحؑ نے ان سے کہا کہ دیکھو الیاس کے دوبارہ آنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ جو الیاسؑ گذر چکا وہی بذات خود نازل ہوگا بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ ایک نبی الیاسؑ کی خو بو پر ظاہر ہوگا چنانچہ وہ ظاہر ہو چکا اور وہی یحییٰؑ زکریاؑ کا بیٹا ہے جسکی آنکھیں ہوں دیکھے (متی باب ۱۷ آیت ۱۲ و ۱۳ اور باب ۱۱ آیت ۱۴) مگر ظاہر پرست یہود نے نہ مانا اور یہی کہتے رہے کہ جب تک خود الیاسؑ نہ آوے مسیحؑ نہیں آسکتا۔ اسی طرح قرآن شریف (سورۃ صف رکوع ۱) میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد ایک رسول آئیگا جس کا نام احمدؐ ہوگا اب ہمارے مخالف مسلمان سب مانتے ہیں کہ پیشگوئی مذکور حضرت نبی کریم صلعم کے وجود باجود میں پوری ہو چکی ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ آپؐ کا نام محمدؐ تھا نہ کہ احمدؐ اور گو دعوائے نبوت کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ مَیں احمدؐ بھی ہوں لیکن مخالف کے سامنے تو ایسا نام حجت نہیں ہے بلکہ وہ تو صرف اس نام کو قبول کریگا جو آپؐ کے ماں باپ کی طرف سے رکھا گیا اور جس نام کے ساتھ آپ لوگوں میں معروف تھے۔ اب اسکی صرف اسی طرح تاویل ہو سکتی ہے کہ جس طرح یحییٰؑ کا نام آسمان پر الیاسؑ تھا اسی طرح نبی کریمؐ کا نام آسمان پر احمدؐ بھی تھا جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے۔ اس سارے بیان سے یہ واضح ہوا کہ بعض اوقات پیشگوئیوں میں ظاہر مفہوم مراد نہیں ہوتا بلکہ پیشگوئی کے الفاظ کسی باطنی حقیقت کی طرف اشارہ کرنیوالے ہوتے ہیں اور بطور مجاز اور استعارہ کے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی اور نہایت واضح مثال نبی کریمؐ کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آپکو دکھایا گیا تھا کہ آپکی وفات کے بعد آپکی ازواج مطہرات میں سے سب سے پہلے سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی بی بی (اطولکن یداً) فوت ہو گی چنانچہ جب آپ نے یہ پیشگوئی

بیان فرمائی تو آپ کی بیویوں نے آپ کے سامنے اپنے ہاتھ ناپے تا یہ معلوم ہو کون پہلے فوت ہوگی جس پر معلوم ہوا کہ حضرت سودہ رضؓ کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں (بخاری کتاب الزکوٰۃ) لیکن آنحضرت کے بعد آپکی بیویوں میں سے سب سے پہلے حضرت زینب فوت ہوئیں اسوقت جاکر یہ معلوم ہوا کہ لمبے ہاتھوں سے مراد ظاہری ہاتھ نہ تھے بلکہ یہ سخاوت کی طرف اشارہ تھا یعنی نبی کریم صلعم کو جو خدا تعالیٰ نے یہ اطلاع دی تھی کہ آپ کے بعد سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی بیوی پہلے فوت ہوگی تو اس سے مراد یہ تھا کہ سب سے سخی اور زیادہ خرچ کرنیوالی بیوی سب سے پہلے فوت ہوگی چنانچہ حضرت زینب رضؓ سب سے زیادہ خرچ کرنیوالی تھیں اور وہی سب سے پہلے فوت ہوئیں مگر یہ حقیقت اسوقت تک پوشیدہ رہی جب تک کہ حضرت زینب رضؓ وفات نہیں پاگئیں۔ لطف یہ کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لمبے ہاتھوں سے ظاہری ہاتھ مراد لینے سے انکار نہیں کیا کیونکہ آپؐ کے سامنے آپکی ازواج نے اپنے ہاتھ ناپے اور آپ نے نہیں روکا۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے سامنے جو بات کی گئی ہو اور آپ نے نہ روکا ہو وہ حدیث تقریری کہلاتی ہے اور واجب التعمیل ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں سے حضرت مرزا صاحب کو پالا پڑا ہے اگر ان میں سے اس زمانہ میں کوئی موجود ہوتا تو اس شور سے آسمان سر پر اٹھا لیتا کہ حضرت ۔۔۔ ۔۔۔ کی پیشگوئی غلط نکلی یعنی پیشگوئی تو یہ تھی کہ لمبے ہاتھ والی یعنی حضرت سودہ رضؓ سب سے پہلے وفات پائیں گی مگر پیشتر اسکے کہ حضرت سودہ رضؓ فوت ہوں حضرت زینب رضؓ اس جہان سے سدھار گئیں تو گویا پیشگوئی غلط نکلی خاصکر جب پہلے سے ہی آنحضرت صلعم اور آپ کی ازواج رضؓ اور صحابہ رضؓ کا یہ خیال تھا کہ ہاتھوں سے یہی ظاہری ہاتھ مراد ہیں۔ مخالف تو اس بات کو اس رنگ میں لیتا کہ دیکھو جی رسول خدا نے ایک پیشگوئی کی تھی کہ میرے بعد سب سے پہلے لمبے ہاتھوں والی بیوی فوت ہوگی اور پھر خود ہی اس پیشگوئی کے ظہور کی کیفیت بھی بتادی تھی کہ ظاہری لمبے ہاتھ مراد ہیں مگر اب جو (نعوذ باللہ) یہ پیشگوئی غلط نکلی اور بجائے سودہ رضؓ کے زینب رضؓ کا پہلے انتقال ہوگیا ہے تو اب انکے صحابہ رضؓ تاویلیں کرتے ہیں کہ اصل میں لمبے ہاتھوں سے مراد سخاوت تھی ظاہری ہاتھ نہ تھے مگر یہ کس طرح ہوسکتا ہے ہم تو پیشگوئی کے وہی معنی مراد لینگے جو کہ خود پیشگوئی کرنیوالے

نے کیئے اور اس لحاظ سے (نعوذ باللہ) پیشگوئی بالکل غلط اور جھوٹی ٹھیرتی ہے“
ناظرین غور فرمادیں کہ کیا یہ وہی طرز نہیں جو حضرت مرزا صاحب کے مخالفین نے اختیار کر رکھی ہے ؟

پھر تشابہ واقع ہونے کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض وقت خود پیشگوئی کرنیوالے کو اپنی پیشگوئی کے متعلق اجتہادی غلطی لگ جاتی ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ عالم الغیب (بالذات) تو صرف خدا تعالیٰ کا وجود ہے باقی انبیاءؑ کو جو کچھ غیب کا پتہ لگتا ہے وہ صرف خدا تعالیٰ کے بتلانے سے پتہ لگتا ہے۔ اسلیئے وہ بعض وقت اپنی طرف سے الہام الٰہی کے کوئی معنی کرتے ہیں مگر پیشگوئی کسی اور مفہوم میں پوری ہوتی ہے مثلاً وہی مثال جو میں استعارہ کی وجہ سے تشابہ واقع ہوجانے کی ضمن میں اوپر دے آیا ہوں یہاں بھی پیش کیجا سکتی ہے یعنی آنحضرتؐ کی اس پیشگوئی کا جو مفہوم آپ نے حدیث تقریری کے ذریعہ بیان فرمایا وہ صحیح نہ نکلا بلکہ خدا کی نظر میں پیشگوئی کسی اور مفہوم میں پوری ہونی تھی جیسا کہ واقعات نے ظاہر کیا۔ ہرچند کہ کجرو مخالف ایسے موقع پر طوفان بے تمیزی پیدا کرتے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سنت بھی جاری ہے، کہ بعض وقت اسکے مقرب انبیاءؑ تک پیشگوئیوں کے صحیح معنی سمجھنے میں اجتہادی غلطی کر بیٹھتے ہیں جیسا کہ اوپر کی مثال سے ظاہر ہے۔ اور صرف یہ ایک مثال ہی نہیں بلکہ اور مثالیں بھی بہت پائی جاتی ہیں مثلاً جب آنحضرتؐ کو ہجرت کے متعلق دکھایا گیا تو آپ نے خیال فرمایا کہ ہجرت یمامہ یا ہجر کی طرف ہوگی فذھب وھلی الیٰ انّھا الیمامۃ او ھجر (بخاری کتاب الرؤیا) مگر خدا کے علم میں یثرب تھا۔ پھر حضرت نوحؑ سے وعدہ تھا کہ طوفان میں تیرے اہل بچائے جائیں گے جس سے انہوں نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ میرے سب رشتہ دار محفوظ رہینگے لیکن جب طوفان نے آپ کے بیٹے کو آن گھیرا تو اسوقت گھبرا کر خدا کے حضور گرے کہ ان ابنی من اھلی (سورۃ ھود) یعنی خدایا یہ کیا ہونے لگا ہے تیرا وعدہ تھا کہ میرے اہل بچائے جائینگے مگر میرا بیٹا باوجود میرے اہل سے ہونے کے ڈوب رہا ہے تو خدا تعالیٰ نے جوابدیا انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح (سورہ ہود) یعنی تیرا بیٹا تیری اہل سے

نہیں کیونکہ یہ بدعمل ہو۔ دیکھئیے حضرت نوحؑ نے لفظ اھل کا مطلب سمجھنے میں غلطی کھائی۔ ناظرین
ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرماویں کہ کیا اگر اسوقت کوئی اِس زمانہ کا مُلّاں سیرت انسان
موجود ہوتا تو ایک طوفان بے تمیزی نہ برپا کر دیتا کہ دیکھئیے حضرت نوحؑ نے فرمایا تھا کہ طوفان
میں میرے سارے رشتہ دار محفوظ رہینگے اور میرے اہل میں سے کسی فرد واحد کیلئے
بھی کوئی خطرہ کا مقام نہیں مگر خود حضرتؑ کے فرزند ارجمند طوفان کی لہروں کا شکار
ہو گئے اور حضرت کی پیشگوئی ویسے ہی رکھی کی رکھی رہ گئی۔ آہ۔ افسوس ہمارے مخالفین
نے حضرت مرزا صاحب کی مخالفت میں اتنا بھی تو نہیں سوچا کہ جو اعتراض ہم مرزا صاحب
پر کر رہے ہیں وہ خدا کے دوسرے رسولوں پر بھی تو وارد ہوتا ہے۔ اگر اس کی وجہ سے
حضرت مرزا صاحب کا کذب ثابت ہو سکتا ہے تو پھر سارے رسولوں کو خیر باد کہو۔
اب میں مختصراً وہ حکمت بھی بتا دیتا ہوں جسکی وجہ سے بعض وقت انبیاءؑ کو
اس معاملہ میں اجتہادی غلطی لگ جاتی ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ عوام الناس میں
یہ مرض ہوتا ہے کہ اپنے نبی کے درجہ میں بہت غلو سے کام لیتے بلکہ اسے بڑھاتے
بڑھاتے خدائی کرسی پر بٹھانے لگ جاتے ہیں چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اپنے متبعین
کی طرف سے اسی قسم کی مہربانیوں کی وجہ سے خدائی رتبہ حاصل کیا ورنہ وہ خود تو خدا کا بندہ
ہی چلاتا رہا کہ اعبدوا اللّٰہ ربّی و ربکم (سورۃ مائدہ) اسلیئے خدا تعالیٰ کی
یہ حکمت ہے کہ انبیاءؑ سے بعض اوقات اجتہادی غلطی ہو جاتی ہے تا یہ اچھی طرح ظاہر
ہو جاوے کہ نبی کے اندر کوئی خدائی طاقتیں نہیں بلکہ خواہ کتنا ہی ترقی کر جاوے آخر وہ
ایک بشر ہی ہے اور صفت عالم الغیب میں اللہ کا شریک نہیں بلکہ جو اللہ تعالیٰ
کی طرف سے اسے معلوم ہوتا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ دوسرا بہت بڑا فائدہ
ایسی اجتہادی غلطیوں میں یہ ہے کہ تا ایسی اجتہادی غلطیاں انبیاءؑ کی صداقت
پر دلیل ہوں کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر نبی نے اپنی طرف سے الہام بنایا ہو اور وہ صادق
نہ ہو تو الہام کے اصل الفاظ اور نبی کی تاویل میں کبھی اختلاف نہ ہونا چاہیئے بلکہ
لازماً وہ آپس میں موافق ہونگے۔ تاویل اور الہام کے الفاظ میں اختلاف ایسی صورت

میں ہو سکتا ہے جب دونو کا منبع الگ الگ ہو یعنی الہام کرنیوالا کوئی ہو اور تاویل کرنیوالے کوئی اور۔ اسی لیئے کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک نبی نے اللہ سے الہام پاکر ایک پیشگوئی کی اور پھر خود ہی اسکی تشریح کرتے ہوئے اس کا ایک مفہوم بیان کیا لیکن بعد میں وہ پیشگوئی کسی اور مفہوم میں ظہور پذیر ہوئی گویا پیشگوئی تو پوری ہو گئی مگر نبی کی تاویل درست نہ نکلی جس سے صاف پتہ لگ گیا کہ اصل پیشگوئی کرنیوالی کوئی اور ذات ہے مثلاً لمبے ہاتھوں والی مثال لے لیجیئے۔ خدا نے آنحضرتؐ کو بتایا کہ آپکی وفات کے بعد سب سے پہلے سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی بیوی فوت ہو گی جسکے معنی آپؐ نے یہ کیئے کہ ظاہری لمبے ہاتھ مراد ہے مگر جب پیشگوئی پوری ہوئی تو معلوم ہوا کہ لمبے ہاتھوں سے سخاوت کی طرف اشارہ تھا ظاہری لمبے ہاتھ مراد نہ تھے جس سے صاف پتہ لگ گیا کہ نبی کریمؐ نے نعوذ باللہ یہ پیشگوئی اپنے کسی علم یا قیاس کی بنا پر نہ کی تھی بلکہ پیشگوئی کرنیوالی دراصل کوئی اور ذات تھی تبھی تو الہام کے الفاظ اور تاویل کے درمیان اختلاف واقع ہو گیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ خود نبی کو بھی الہام الٰہی کا مطلب سمجھنے میں بعض اوقات اجتہادی غلطی لگ جاتی ہے۔ اس لیئے ہمکو چاہیئے کہ ہم ہمیشہ الہام کے اصل الفاظ کو مدنظر رکھیں یعنی پیشگوئی کرنیوالے کی تاویل پر پیشگوئی کی صحت کی بنیاد نہ رکھیں بلکہ اصل الہام کے الفاظ پر نظر رکھیں اور پھر دیکھیں کہ کیا پیشگوئی کا ظہور کسی ایسے مفہوم میں ہو گیا ہے جسے الہام کے الفاظ سنت اللہ کے موافق برداشت کر سکتے ہوں اگر ہو گیا تو سمجھ لیں کہ وہ پوری ہو گئی ہے خواہ پیشگوئی کرنیوالے نے اسکے خلاف ہی کوئی تاویل کی ہو۔ (باقی آئندہ)

ڈاکٹر کی ہدایت